ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

کتابی سلسلہ نمبر 85 تا 90

مرتبین

سیّد عامر سہیل

عبدالعزیز ملک

محمد داؤد راحت

انگارے

مطبوعات

دورِ ثانی

انگارے (ملتان)

کتابی سلسلہ نمبر ۸۵ تا ۹۰

جنوری تا جون ۲۰۱۷ء

ویب سائٹ: www.angaray.com

ای میل: angarey90@gmail.com

مراسلت: شعبۂ اردو: سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

فون: ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

سرورق: الیاس کبیر

کمپوزنگ: فہد ابرار

ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

قیمت: سو روپے فی شمارہ

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۱۰۰۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۵

کچھ باتیں بانو قدسیہ کے بارے میں:

۲۔ بانو اور اشفاق: داستان سرائے کے مسافر — ڈاکٹر سعید احمد — ۷

۳۔ بابو قدسیہ: رومانویت اور روحانیت کا استعارہ — عبدالعزیز ملک — ۱۱

۴۔ بانو آپا — محمد رؤف — ۱۵

۵۔ حاصل گھاٹ: ایک مطالعہ — ڈاکٹر محمد عباس — ۲۰

۶۔ بانو قدسیہ کے افسانہ ''کال کلیچی'' میں پرندوں..... — عاصمہ روبینہ — ۲۴

مضامین:

۷۔ ''آوازِ دوست'' ایک ہمہ جہت ادبی فن پارہ — ڈاکٹر مسرت بانو — ۳۱

۸۔ منظور راہی کے افسانے ''عظیم لیبارٹری''..... — شکیلہ پروین

سلسلہ وار ناول:

۹۔ جھکا جان (قسط اوّل) — عمران ازفر — ۴۳

کہانیاں:

۱۰۔ فصیلِ جان — لیاقت علی — ۵۱

۱۱۔ پھٹا ہوا نوٹ — محمد عباس — ۶۱

۱۲۔ ڈھائی سو بٹا تیس — ضیغم رضا — ۸۹

عابد خورشید۔ ایک تعارف:

۱۰۔ چند باتیں عابد خورشید کے لیے — سید عامر سہیل — ۹۵

بجھ گئی آنکھ تو پھر راکھ بہا دی جائے — ۹۶

کیسی اُفتاد ہے کہ ہوش میں آنے لگا ہے — ۹۷

آج کچھ دِل کھچا کھچا سا ہے — ۹۸

وہ لکھ کے دے گا مجھے جو بھی کچھ پڑھا ہوا تھا — ۹۹

گرد چہرے سے جھاڑنا ہے مجھے — ۱۰۰

بے سبب آئینے میں رکھا ہوا — ۱۰۱

دُکھ پہاڑوں میں بھر گیا کوئی — ۱۰۲

ساحلوں کو چھوڑ کر، گہرے سمندر تک گئے — ۱۰۳

آئینہ دیکھتا رہ گیا تھا — ۱۰۴

میں اُس سے دِل کی کہتا ہوں، بات کتابی ہو جاتی ہے — ۱۰۵

گزرے ہوؤں کا نقش بھی رکھا بہاؤ نے — ۱۰۶

گزر گئے ہیں وہ لمحے مجھے یہ غم تو ہے — ۱۰۷

ہر ایک شاخ کی جب اپنی اپنی خُو ہوگی — ۱۰۸

رات، مجھ کو چھوڑ کے سوئی الگ — ۱۰۹

ہم پر اکثر عشق کا موسم یوں ہوتا ہے — ۱۱۰

سانس کا، موت کا، محبت کا — ۱۱۱

زمیں کے زخم کو چاہو تو بھول جاؤ اَبھی — ۱۱۲

سید عامر سہیل

چند باتیں

ہمارے یاں عام طور پر شعر و ادب کے زوال، ادب اور معاشرے کے بیچ روز بڑھتی ہوئی دوری (مغائرت)، ادب کی حقیقتوں (گراؤنڈ ریلیٹیز) سے چشم پوشی اور ادیب کے مجہول کردار پر بہت رونا رویا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ادب و ادیب جاں کنی کے عالم میں اس حد تک پہنچ چکے ہیں جہاں روح کسی بھی لمحے پرواز کرنے والی ہو یا پھر ایسا منظر سامنے آتا ہے جیسے مرگِ ادب کا سوگ منایا جا رہا ہو۔ مگر غور کیا جائے تو مرگِ ادب کے سوگواروں میں زیادہ تعداد ادبی جلسوں میں غیر تخلیقی (مصنوعی) سنجیدگی طاری کیے نقادوں، تسلسل یا غیر تسلسل سے جاری ہونے والے ادبی رسائل کے مدیروں اور ملازمتوں کی خاطر اپنی پیشہ ورانہ کارکردگی رپروفائلز (سی وی) کو ''بہتر اور مضبوط'' بنانے والے خوف زدہ دانشوروں اور استادوں کی ہوتی ہے۔ مجھ سمیت بہت سے لوگ ادب کی نیم جانی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے کسی ایک حوالے سے یہ بات جزوی طور پر درست بھی ہوتا ہم میرے خیال میں یہ نقطہ نظر ایک عمومی مگر ناپختہ تنقیدی رائے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ادب کے زوال کا نتیجہ اخذ کرنے والے یک طرفہ اور جانب دارانہ رویے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص جب ادب و ادیب کا موازنہ موجودہ عہد کے ذرائع ابلاغ اور ان میں کام کرنے والے آسودہ حال لوگوں سے کیا جاتا ہے تو ایک بڑا گیپ دیکھنے کو ملتا ہے۔ آسودگی (مالی و دیگر) کے تناظر میں یہ بات دوست ہو سکتی ہے مگر دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا گزشتہ دس پندرہ برس میں اچھا ادب تخلیق ہونا بند ہو گیا ہے۔ ناول، افسانہ، نظم، غزل نیز تحقیق و تنقید وغیرہ کے شعبوں میں کیا نہایت اہم ترین کتب سامنے نہیں آئیں۔ اگر صرف بیان کردہ اصناف ہی کی اہم اور بڑی کتب کا نام لکھا جائے تو اچھی خاصی تعداد سامنے آ جائے گی۔ ادبی رسائل بھی اپنی تمام تر خامیوں کے ساتھ ''دبستان سازی'' اور ''شخصیت پرستانہ ادارت'' سے نکل کر آزادانہ کام کر رہے ہیں اور گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ان کی تعداد میں حوصلہ افزا اضافہ ہوا ہے۔ کتب کا اشاعتی معیار اور دیگر شعبوں میں بھی خاصی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ

اس حوالے سے مایوس کن صورت حال قطعی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ماضی میں ادب و ادیب ہر دو کو ایک خاص حلقے ہی میں عزت و ناموری حاصل رہی ہے، اور وہ کبھی عوامی مقبولیت کے خواہاں بھی نہیں رہے۔ ادب اپنے دوام کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ادب میں تخلیقی جوہر ہی دوامی جوہر ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ کہ ادیب اور دانشور ہمیشہ ہی سے گوشہ نشین رہے ہیں۔ سو آج بھی وہ اپنا کام کر رہے ہیں جیسے کہ پہلے کرتے رہے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا مقصد ادب و ادیب کے حوالے سے کسی مثالی صورت حال کو بیان کرنا یا موجودہ حالات کو مثالی قرار دینا قطعی نہیں ہے تاہم یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آج کی صورت حال کسی بھی طور پر مایوس کن نہیں ہے بلکہ آج ادیب و دانشور کے پاس لکھنے، پڑھنے اور ابلاغ کے بے شمار مواقع موجود ہیں۔ تخلیق کے حوالے سے بھی بدلتے ہوئے حالات میں نئے نئے تناظرات اور موضوعات چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں۔ ادب اور ادیب کو صحافی یا میڈیا پرسن سے موازنہ کرنا شاید درست تجزیہ نہیں ہوگا۔ اب یہاں پھر وہی پرانا سوال جنم لیتا ہے کہ ادیب کی کیا ذمہ داری ہے اور وہ کیا اس ذمہ داری کو پورا کر رہا ہے یا نہیں۔ اب ادب اور ادیب کی ذمہ داری کی بات کی جائے تو اسے ترقی پسندانہ رویہ سمجھ کر پیش پا افتادگی کا فتویٰ بھی صادر کر دیا جاتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے مابعد جدید نقادوں، جو متن سے باہر دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں کو ادیب کے نام اور عوامی رائے عامہ کے حوالے سے کردار ادا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سعید احمد

بانو اور اشفاق۔۔۔داستان سرائے کے مسافر

بانو قدسیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔۔۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اردو دنیا میں سوگ کا عالم ہے۔بلاشبہ بانو قدسیہ عصرِ حاضر کی سب سے بڑی افسانہ نگار تھیں۔انھوں نے ناول ڈرامے اور افسانے میں اپنی علاحدہ ،منفرد اور معتبر شناخت بنائی اور اپنی زندگی ہی میں ایک داستانوی کردار بن گئیں۔

بانو قدسیہ اور اشفاق احمد مجھے ہمیشہ ایک رومانوی اور داستانوی جوڑا لگتا ہے۔اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا جوڑا بجا طور پر ہنسوں کا جوڑا (Pair of swans) کہلاتا تھا۔کہتے ہیں کہ تمام پرندوں میں سے ہنس آپس میں مثالی محبت رکھتے ہیں۔ہنس زندگی بھر ایک ہی جوڑا بناتا ہے اور اس جوڑے میں سے اگر ایک کھو جائے یا مر جائے تو دوسرا ساری عمر اکیلا ہی رہتا ہے اور دوبارہ جوڑا نہیں بناتا۔

بانو قدسیہ اور اشفاق احمد مجھے ہمیشہ رومانوی داستانوں کے دو کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی کے افسانوں اور ڈراموں میں داستانوی انداز بہت نمایاں ہے۔داستانوں سے ان کی محبت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اشفاق احمد اور بانو نے جو پہلے پہل رسالہ نکالا تھا،اس کا نام بھی ''داستان گو'' تھا،اور پھر اشفاق احمد تو واقعی ایک ماہر داستان گو (Story Teller) کے روپ میں نمایاں اور مشہور ہوئے۔اشفاق احمد نے سائنس فکشن افسانوں کے مجموعے ''طلسم ہوش افزا'' کا انتساب بھی اردو کی عظیم داستان ''طلسم ہوش ربا'' کے نام کیا ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی داستانوں سے محبت ہی کی بدولت ان کا گھر ''داستان سرائے'' بن گیا۔ بانو قدسیہ کے کئی افسانوں اور ڈراموں کے عنوانات ہی سے داستانوی عناصر سے ان کی محبت کا پتا چلتا ہے۔''علی بابا''،''کھل سم سم'' اور ''ہزار پایہ'' وغیرہ۔بانو قدسیہ اور اشفاق احمد دونوں بڑے فنکار تھے،دونوں کے فکر وفن کے بیشتر زاویے آپس میں ملتے تھے۔ان مشترک پہلوؤں میں ایک رومانوی انداز بھی ہے۔بانو اور اشفاق کے افسانوں کے متنوع موضوعات ہیں،لیکن تمام تر رنگا

رنگی کے باوجود ایک صفت ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ہر موضوع اور ہر افسانے پر محبت اور رومان کی ایک اوپری تہہ ضرور ہوتی ہے۔ان ''شوگر کوٹڈ'' انسانوں کے نیچے کبھی حزن وملال اور سوز وگداز کے ذائقے ہوتے ہیں اور کبھی تصوف کی چاشنی۔۔۔

تصوف بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا ایک محبوب موضوع ہے جو ان دونوں میاں بیوی کی اکثر تحریروں اور باتوں سے جھلکتا ہے۔اشفاق احمد تو ''بابا'' کہتے خود ''بابا صاحبا'' ہو گئے۔یاد رہے ''بابا'' اشفاق احمد کا ایک ناقابلِ فراموش افسانہ بھی ہے۔''گڈریا'' اور ''بابا'' میرے پسندیدہ افسانے ہیں۔بانو قدسیہ نے اگرچہ ہمیشہ اشفاق احمد ہی کو اپنا پیر ومرشد گردانا ہے اور ہمیشہ عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا ہے،لیکن فی الحقیقت بانو قدسیہ ہی اردو افسانے کی رابعہ بصری ہیں اور تصوف کی روشنی ان کی شخصیت کے گرد یوں دائرہ تجلی بنا دیتی ہے جیسے ماہ تمام کے گرد ہالہ نور بن جاتا ہے۔بانو قدسیہ نے عورتوں کی نفسیات کو جس طرح اپنے ناولوں ،ڈراموں اور افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور انہیں جس خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے،اس ژرف نگاہی اور باریک بینی میں مشکل ہی سے ان کا کوئی حریف ہوگا۔کلو،کال کلیچی اور امربیل وغیرہ اس قبیل کے خوب صورت افسانے ہیں۔مجھے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریروں میں ایک پہلو بطورِ خاص بہت متاثر کرتا ہے اور وہ ہے عصری علوم کا شاندار مطالعہ۔نفسیاتی مطالعات اور سائنسی علوم دونوں ادیبوں کی تحریروں میں بڑی خوب صورتی سے ظاہر ہوئے ہیں۔اشفاق احمد کے سائنسی شعور کے لیے ان کا افسانوی مجموعہ ''طلسم ہوش افزا'' دیکھا جا سکتا ہے۔جبکہ بانو قدسیہ کی نفسیات اور سائنس سے دلچسپی ان کے ناولٹ ''موم کی گلیاں'' اور مشہور ناول ''راجا گدھ'' میں بہت نمایاں ہے۔بطورِ خاص ''موم کی گلیاں'' میں شہد کی مکھیوں کا مطالعہ بہت عمیق نظروں سے کیا گیا ہے۔شہد کی مکھیوں کا مطالعہ کرنا باقاعدہ ایک سائنس ہے جو Apiology کہلاتی ہے۔قرآنِ مجید میں بھی سورۃ نحل میں شہد کی مکھیوں اور اس کے گھر (چھتے) کی مثال دی گئی ہے،شہد کا چھتہ ایک پورے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور بانو قدسیہ نے اس کا جس طرح ایک انسانی گھرانے اور پھر معاشرے سے تقابل کر کے دکھایا ہے،وہ مصنفہ کے عمرانی شعور کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔

دراصل بانو قدسیہ کو تمثیل اور تقابل کا انداز بہت مرغوب ہے،نفسیات ہو یا سماجیات سائنس ہو یا مذہب بانو قدسیہ نہایت ہنرمندی سے کہانی لکھتی ہیں۔''راجا گدھ'' بلاشبہ اردو کے چند شاہکار ناولوں میں سے ایک ہے اور اردو کے یہ چند شاہکار ناول خواتین ہی نے تخلیق کیے ہیں،

میری مراد ''آگ کا دریا''، ''دشتِ سوس'' اور ''راجا گدھ'' سے ہے۔

''راجا گدھ'' میں بانو قدسیہ نے فلسفہ حرام وحلال کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔آپ اس تھیوری سے اتفاق کریں یا نہ کریں، آپ اسے پاپولر سائیکالوجی کا نام دیں یا روحانی سائنس سے تعبیر کریں، ''راجا گدھ'' رزقِ حرام سے انسانی جینز میں تخریب، انتشار یا اختلال کا فلسفہ انھوں نے بڑی فنکارانہ چابکدستی اور مؤثر و مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔''راجا گدھ'' اپنے تمام تر نزاعی مسائل اور مباحث کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا شاہکار اور عہد ساز ناول قرار پاتا ہے۔

اگر اشفاق احمد ایک جہاں گرد اور جہاں دیدہ شخصیت کے روپ میں نظر آتے ہیں تو بانو قدسیہ نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔میری مراد عالمی ادب کے چشموں سے سیرابی اور فیض یابی سے ہے۔اشفاق احمد کے تبحرِ علمی اور وسعتِ مطالعہ کے سبھی قائل ہیں، اگر نگاہِ انصاف سے دیکھیں تو بانو قدسیہ بھی عالمی ادب پر گہری نظر رکھتی ہیں۔قدیم ہندی اساطیر ہوں یا یونانی قصے، فارسی حکایات ومثنویات ہوں یا انگریزی ادب کے شاہکار بانو قدسیہ کی تحریروں میں یہ حوالے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔خصوصاً ''راجا گدھ'' پر خواجہ فریدالدین عطار کی مثنوی ''منطق الطیر'' کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر حیوانی کہانیوں سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔اس اعتبار سے بھی اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے افسانوں میں بڑی دلکشی محسوس ہوتی ہے۔دونوں میاں بیوی کے افسانوں میں جانوروں اور پرندوں کی کہانیوں جا بجا ملتی ہیں۔اشفاق اور بانو نے افسانوں میں سبق سکھانے کے لیے'' حدیثِ جانوراں'' سے خوب کام لیا ہے۔میری نگرانی میں ایک طالبہ عاصمہ روبینہ نے ''اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے افسانوں میں حیوانات کی علامتی حیثیت'' پر ایم اے اردو کا ایک خوب صورت مقالہ تحریر کیا تھا۔عاصمہ نے اس تقابل میں بانو قدسیہ کا پلڑا بھاری دکھایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ واقعی بانو قدسیہ بعض پہلوؤں میں اشفاق احمد سے آگے نظر آتی ہیں، البتہ مجموعی طور پر اشفاق احمد کا ادبی قد بڑا نظر آتا ہے۔یہاں میرا مقصود موازنہ اشفاق احمد و بانو اقدسیہ ہرگز نہیں ہے، لیکن مجھے دونوں میاں بیوی یوں یک جان دو قالب نظر آتے ہیں کہ ان کی روحیں بھی ایک دوسرے میں حلول کیے نظر آتی ہیں۔افسوس! آج بانو قدسیہ بھی ہم سے رخصت ہو گئیں۔اردو ادب ایک ایسی ادیبہ سے محروم ہو گیا جس کی تحریروں اور باتوں میں لوک دانش،

عصری آگہی اور دور اندیشی کا انمول خزانہ تھا۔وہ ساری عمر خیر کی نصیحت کرتے رہے، آسانیاں بانٹتے رہے۔اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں انہیں ایک خوب صورت گھر عطا فرمائے جس کی پیشانی پر لکھا ہو ''داستان سرائے''

☆☆☆

عبدالعزیز ملک

بانو قدسیہ: رومانویت اور روحانیت کا استعارہ

تخلیق سے زیادہ مشکل اور کربناک عمل شاید اور کوئی نہ ہو، لیکن اس کے باوجود انسان اس تجربے سے گزرتا رہا ہے۔ ادب انسان کی انفرادی ذہانت کا تخلیقی اظہار ہے، جو زندگی کو توانائی اور طاقت بخشتا ہے۔ ادیب اگر ارفع خیالات کو دلکش اور دلفریب پیرائے میں ڈھال کر قارئین کے اذہان کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو ایسا تخلیق کار مرتا نہیں بلکہ ابدی زندگی کی مسند پر متمکن ہو جایا کرتا ہے۔ بانو قدسیہ بھی مذکورہ تخلیق کاروں کے زمرے میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ ۴ فروری ۲۰۱۷ء کو یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ نشر کی گئی کہ بانو قدسیہ اب ہم میں نہیں رہی۔ کچھ ادبی حلقوں نے اسے ناقابلِ تلافی نقصان تصور کیا تو کچھ نے کہا کہ اردو کی ادبی دنیا اجڑ گئی۔ میرا جہاں تک خیال ہے کہ آج بھی اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی موجود رہیں گے، اس لیے ادبی دنیا کے اجڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں۔۔۔! ایک بات ضرور ہے کہ بانو قدسیہ کی کمی ضرور محسوس ہوتی رہے گی۔

بانو قدسیہ ادبی دنیا کی ایک ایسی ادیبہ تھیں جو نصف صدی سے بھی زائد ادب کے افق پر روشن ستارہ کی مانند چمکتی رہیں۔ ان کی کہانیوں میں تصوف اور رومان کا حسین امتزاج قارئین کو تادیر متاثر کرتا رہے گا۔ بانو قدسیہ کی کہانیوں کی مخصوص رومانی فضا جس میں ان کی انفرادیت رچی بسی دکھائی دیتی ہے، شروع سے لے کر آخر وقت تک قائم و دائم رہی۔ ان کا قلم جن دنوں اردو اور پنجابی کہانیاں تخلیق کر رہا تھا، اس زمانے میں کہانی اپنے عروج پر تھی۔ ممتاز مفتی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور اس قبیل کے بیسیوں افسانہ نگار اپنا نام اور مقام پیدا کر چکے تھے۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، نثار عزیز بٹ، خالدہ حسین اور خدیجہ مستور جیسی ہستیوں کے درمیان میں اپنا نام اور مقام پیدا کرنا یقیناً تخلیقی وفوریت اور ارفع تخیل کی حامل شخصیت ہی کر سکتی تھی۔ ان کی کہانیوں کی جادوئی دنیا فکشن پسندوں کو نصف صدی سے زائد مسحور کرتی رہی اور کئی صدیاں مزید کرتی رہے گی۔ ان کے افسانوں

اور ناولوں کی دنیا میں رومان بھی ہے، جنسی حقیقت نگاری بھی اور انسانیت کے حق میں آواز بھی۔ مزید براں اعلیٰ معاشرے کی رنگ رلیاں، ان کا منافقانہ رویہ، کھوکھلا پن اور غریب طبقے کے مسائل بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند اور حساس دل رکھنے والی محنتی خاتون تھیں۔ شہرت اور ادبی مقام و مرتبہ کے حصول میں ان کی ان تھک مساعی، مسلسل محنت، کام سے لگن اور ادب سے غیر مشروط وابستگی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان خصوصیات کی بدولت بانو قدسیہ نے اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اتنی شہرت، عزت اور پیار بہت کم ادیبوں کے حصے میں آتا ہے جو بانو قدسیہ کے حصے میں آیا۔ نئے لکھنے والے بہت سے ایسے لکھاری ہیں جو بانو قدسیہ کے اسلوب اور خیالات کی پیش کش سے متاثر ہیں اور ان کے انداز میں تخلیق کرنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے جس ماحول میں پرورش پائی وہ فن اور علم پرستوں سے بھرپور تھا۔ گھریلوں ماحول سے بڑھ کر تعلیمی اداروں میں بھی ایسی فضا تھی جو لکھنے اور پڑھنے والوں کے موافق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بانو قدسیہ نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، غلام محی الدین اسد، ڈاکٹر عنایت اللہ اور آفتاب احمد جیسی شخصیات سے اکتساب کیا، جس نے ان کی زندگی میں سادگی، متانت اور نامعلوم کو معلوم میں بدلنے کا ڈھنگ عطا کیا۔ وہ متجسس ذہن کی مالک، دھیمی طبیعت، خلوت پسند اور کم گو خاتون تھیں۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر اسے اشفاق احمد جیسی نابغہ روزگار شخصیت کا ساتھ میسر آیا، جس نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مزید اُجاگر کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''واماندگیٔ شوق'' ۱۹۵۰ میں ادبِ لطیف میں شائع ہوا اور اس کے بعد سے لے کر اب تک ان کی لگ بھگ ستائیس کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں راجا گدھ، امربیل، توجہ کی طالب، آتشِ زیرپا، فٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا قدم، حاصل گھاٹ، دوسرا دروازہ، آسے پاسے اور حاصل گھاٹ نمایاں ہیں۔ ممتاز مفتی نے بانو قدسیہ کی شخصیت کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ''بانو ایک ست رنگی شخصیت ہے۔ پرزم کی طرح اوپر سے بے رنگ، اندر رنگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔'' ان کی شخصیت کا یہی سحر ہے کہ اب وہ ادبی دنیا میں بانو قدسیہ نہیں بلکہ بانو آپا کے نام سے جانی جاتی ہیں۔

بانو قدسیہ کے فکشن کے بیشتر کردار انٹلیکچول سطح پر فائز نہیں ہیں بلکہ وہ عام آدمی کے روپ میں سامنے آتے ہیں جو ذہنی اور روحانی مسائل کو سلجھانے کی بجائے اپنے روزمرہ کے سماجی اور معاشرتی مسائل میں گھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ عورت کو بانو قدسیہ نے بالکل منفرد اور

انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ عورت کو کہیں بھی مرد کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ وہ عورت کو عورت کے درجے پر رکھ کر مرد کو اس کا محافظ بننے کا درس دیتی ہے۔ ان کے ہاں عورت کا وہ تصور نہیں جو فیمنزم میں دکھایا جاتا ہے، جس میں عورت مردانہ معاشرے کی اقدار کے خلاف صدا بلند کر کے اپنی ذاتی شناخت کی متمنی ہو۔ وہ عورت کے مقام کو معاشرے میں نظر انداز بھی نہیں کرتی بلکہ سماج کی گاڑی میں عورت اور مرد کو دو پہیے گردانتی ہے جن کا اپنا اپنا مقام متعین ہے اور وہ ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ بانو کے ہاں عورت مرد سے منسلک ہے اور اس کے ہمرکاب سفرِ زیست طے کرتے دکھائی گئی ہے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں نسوانیت اور تصوف کے عناصر جا بہ جا موجود ہیں جن کو آسانی سے نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ تصوف کے سلسلے میں وہ قدرت اللہ شہاب سے متاثر ہیں جن پر انھوں نے ''مردِ ابریشم'' کے عنوان سے کتاب بھی تحریر کی۔ ان کے معروف ناول ''راجا گدھ'' میں حلال اور حرام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ بھی ان کے اسلامی تصوف سے متاثر ہونے کی بین دلیل ہے۔ اس ناول میں وہ قاری کو احساس دلاتی ہیں کہ رزقِ حرام پر پرورش پانے والی قوم روحانی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ دیوانگی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس ناول میں بانو قدسیہ نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقا، اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب، مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی گئی ہے، مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف اور روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں ان کا علاج فرائیڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا کیوں کہ ان کا طریقہ علاج رو حانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔''

اس ناول کے تمام نمایاں کردار اپنے ضمیر کے سامنے مجرم ہیں، خود ہی اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، خود ہی اپنے گواہ ہیں اور خود ہی فیصلے صادر کرتے ہیں۔ یہ تمام کردار علامتی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور معاشرے کے مجموعی رویوں کے نمایندہ بن کر سامنے آتے ہیں

۔ناول میں پرندوں کی تمثیل سے اپنے نظریے کو تقویت بخشنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح پرندوں کی مجلسِ آرائی ہمیں فرید الدین عطار کی ''منطق الطیر'' میں ملتی ہے یا برطانوی شاعر جیفری چاسر کی نظم ''پارلیمنٹ آف فاؤل'' (Parlement of Fouls) میں، جہاں پرندوں کی نوک جھونک سے انسانی رویوں پر طنز کے عنصر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ نے جو اس ناول میں پرندوں کی کانفرنس کا ذکر کیا ہے وہ فرید الدین عطار اور جیفری چاسر کی تحریروں سے اخذ شدہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کانفرنس میں جو نمایاں مقام ''راجا گدھ'' کو دیا گیا ہے وہ پورے ناول کی بنت کاری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور استعاراتی اور علامتی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ رزق حرام کمانے والوں کی علامت جو خود محنت نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی کمائی پہ ہاتھ صاف کرتے ہیں ۔اس ضمن میں ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجا گدھ بن جاتا ہے، اس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں۔''

گدھ اپنی خوراک کے لیے مردار پر لپکتا ہے اور اس کے مقابل اگر عقاب کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسبِ حلال اور کسبِ حرام کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حرام اور حلال کے تصور کو منطقی اور استدلالی بنانے کے لیے مصنفہ نے اسے نسلیات میں جین کے تصور سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مختصراً اس ناول میں بانو قدسیہ روحانیت اور تصوف کی قائل دکھائی دیتی ہیں اور سیکولر نظریے کو رد کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ تلاش کا دائرہ روحانیت سے جتنا دور ہوتا جائے گا اس کے نتائج اتنے ہی خراب ہوتے جائیں گے۔

راجا گدھ اور اس کا موضوع بانو قدسیہ کی مجموعی تخلیقی کائنات کے موضوعات کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے جس میں رومانویت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ اس کا فکشن منفرد اسلوب کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے دیگر فکشن نگاروں سے انوکھے خدوخال بناتا نظر آتا ہے۔ رومانویت اور روحانیت کے امتزاج سے وہ ایسی فضا تخلیق کرنے پر قدرت رکھتی ہیں کہ قاری اس کے سحر سے باہر نہیں آ سکتا۔

☆☆☆

محمد رؤف

بانو آپا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

بانو آپا کے سانحہ ارتحال سے زندگی اور ادب کے کئی ایک ابواب بیک وقت پایہ تکمیل کو پہنچ گئے جبکہ اسی تناظر میں متعدد پہلوؤں پر از سر نو بحث کا آغاز بھی ہو گیا۔ شاداب ہمالیائی سلسلے کے برف زاروں سے جنم لینے یا کسی سنگلاخ پہاڑ کی چھاتی سے چشمے کی مانند پھوٹنے والا زندگی کا سفر آبشار کی طرح گرتا، ندیوں میں بدلتا اور دریا کی طرح بہتا بالآخر کسی سمندر میں ڈھل جاتا ہے۔ اب تک ہزاروں، لاکھوں یا کروڑوں نہیں اس دنیا میں جنم لینے والے اربوں انسان رنگ برنگ اور نو بہ نو قافلہ ہائے ازلی کا حصہ بنے اور آخر کار اسی دارالفنا کے سفر پر روانہ ہو گئے جس کا انجام دارالبقا ہے۔ زندگی نے نہایت پرفریب انداز میں ان عشاق کو ورغلایا، اپنایا اور لبھایا کہ وہ سب کچھ بھول کر مادہ پرستی کو حاصل آفرینش سمجھ بیٹھے لیکن جب وہ اس سحر کاری کے دام الفت میں الجھ کر رہ گئے تو زندگی نے کسی روز چپکے سے انہیں پھر اسی نغمہ سرمدی کو سونپ دیا جو پیغام ابدی کا واضح اظہار ہے۔ یوں رب کائنات کا وہ اعلان سچ ثابت ہو کر رہا کہ **کل نفس ذائقة الموت**۔

28 نومبر 1928ء کو پنجاب کے ضلع فیروز پور میں آنکھ کھولنے والی آپا نے 4 فروری 2017ء کو لاہور میں 88 سالہ حیات مستعار خالق حقیقی کے سپرد کی تو ان کے چہرے پر وہی اطمینان، آسودگی اور مسکراہٹ تھی جو زندگی بھر ان کا خاصا رہی۔ کنیئرڈ کالج سے گریجوایشن اور 1951ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی جبکہ بعد ازاں ان کی شادی معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور صوفی اشفاق احمد سے ہوئی، داستانوں سے خصوصی شغف میاں بیوی دونوں کا نقطہ ارتکاز رہا، داستانوی کردار کے طور پر شہرت ملی، داستان گو نکالنے میں معاونت کی، داستان گوئی کو پروان چڑھایا اور داستان سرائے کو ہی مسکن بنائے بالآخر خود ایک داستان بن گئیں۔

بانو قدسیہ کیسی مصنفہ تھیں؟ انہوں نے اردو ادب کو کیا دیا؟ راجہ گدھ کو ادب عالیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ وہ خود لکھتی تھیں یا ان کو صاحب کتاب بنانے والے درحقیقت اشفاق احمد تھے؟ وہ بڑی مصنفہ اور دانشور ہیں یا ان کے شوہر نامدار؟ یہ اور اس سے مربوط دیگر درجنوں سوالات کا ذکر بعد میں، پہلے مجھے یہ کہنے دیجیے کہ بانو آپا کا انتقال اردو ادب کیلئے ایک بھونچال سے کم نہیں۔ وہ موجود تھیں تو اردو زبان و ادب کو ایک ثقہ ادیب، ایک داستان گو اور ایک سائنسی فہم رکھنے والی مصنفہ کے علاوہ ایک عالمی شہرت یافتہ نام کا آسرا و سہارا دستیاب تھا۔ اہل اردو کو ایک دست شفقت میسر تھا، ایک مہربان مسکراہٹ نصیب تھی اور سب سے بڑھ کر ایک گوشہ عافیت حاصل تھا۔ لیکن ان کے اٹھنے سے گویا یہ تمام چیزیں بڑی حد تک قصۂ پارینہ بن گئی ہیں۔ کون جانے کہ آئندہ نسل کو اس طرح کی کوئی ہمہ جہت شخصیت ملتی بھی ہے یا نہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت سے نسبت انسان کو بلا وجہ عزت و شہرت کے انتہائی اعلیٰ زینوں پر پہنچا دیتی ہے اور صاحب نسبت زندگی میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیئے بغیر ہی دنیا کی ان نعمتوں کا ذائقہ چکھ لیتا ہے جو بصورت دیگر اسے کبھی دستیاب نہ ہوتیں۔ اس حوالے سے صرف ادب ہی نہیں، سیاست و ریاضت سمیت زندگی کے ہر میدان میں آپ کو سیکڑوں ہزاروں مجاور ملیں گے جن کا کام آباؤ اجداد کے کارناموں کو کیش کرانے اور ان کے نام پر ملنے والی روٹیاں توڑنے کے سوا کچھ نہیں۔ یا کچھ لوگ یہ شکایت کرتے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان میں خوبیاں تو بہت تھیں لیکن ان کی کسی بڑی شخصیت کے ساتھ نسبت نے انہیں نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اس کی واضح مثال فرزند اقبال ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کو ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ پوری دنیا انہیں محض فرزند اقبال سمجھتی ہے اور ان کی اپنی خوبیوں کو اجالنے اور ماننے کیلئے تیار نہیں۔ وہ اس کیلئے وقتاً فوقتاً برگد کی مثال دیا کرتے کہ جیسے بڑے درخت کے نیچے کوئی چھوٹا پودا پنپ نہیں سکتا، اسی طرح بڑی اور شہرت یافتہ شخصیات کے متوسلین بھی عمر بھر اپنی الگ پہچان کو ترستے رہتے ہیں۔ تاریخی تناظر میں ان کی بات بڑی حد تک توجہ طلب بلکہ صداقت پر مبنی تھی لیکن بانو قدسیہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس دیرینہ روایت کو بھی باطل ثابت کر دیا۔

اشفاق احمد کو جیسی محبت ان سے تھی اور جس طرح وہ ان کی زندگی کا حاصل ٹھہریں یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ شعر و ادب کا معمولی ذوق رکھنے والے احباب بھی دور جدید کے اس رومانوی جوڑے اور اس کی داستان حیات سے آشنا ہیں۔ اشفاق احمد زمانہ طالبعلمی میں ہی بطور ادیب اپنی پہچان بنا

چکے تھے لیکن بانو قدسیہ کے کریڈٹ پر ایسا کوئی سرخاب کا پر نہیں تھا۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد آہستہ آہستہ ان کی ادبی تحریریں بھی منظر عام پر آنے اور ادبی دنیا میں نمایاں مقام پانے لگیں۔ خاص طور پر عورتوں سے متعلق ان کی شاہکار تحریروں نے ادبی پنڈتوں کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بانو آپا کے افسانوں کی دھوم مچتے ہی ایک خاص طبقے نے انہیں ہدف تنقید بنالیا اور لگا دن رات ان پر کیچڑ اچھالنے۔ خاص طور پر 1981ء میں راجہ گدھ جیسے عالمی معیار کے ناول کی اشاعت اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوئی اور مخالفین کی توپوں کے منہ کھل گئے۔

اس دور میں انہیں دو طرح سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک تو یہ کہ وہ خود نہیں لکھ رہیں بلکہ اشفاق احمد انہیں بڑا ادیب بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے ناولوں اور افسانوں کو ان کے نام سے شائع کرا رہے ہیں دوسرا یہ کہ راجہ گدھ کا موضوع حکومتی اشارے کا کمال ہے جس میں کمیونزم اور آزاد خیالی کو نشانہ بناتے ہوئے نوجوان نسل کے ذہن بدلنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ ایسی متنازع باتیں پر لگا کر اڑتی اور ہوا کے دوش پر سوار جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ یہی بانو آپا کے ساتھ بھی ہوا اور ایک مخصوص، مغرب زدہ طبقے نے کچے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرنے کی مذموم کوشش کی کہ ان کے ناول وافسانے درحقیقت اشفاق احمد کے راہوار قلم کا شاہکار اور اعیان حکومت کی اسلامی سوچ کے آئینہ دار ہیں۔ کئی نقاد اس امر کو جنرل ضیاء الحق کی اسلامائزیشن سے جوڑتے اور بانو آپا کو اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور ان کے مرشد قدرت اللہ شہاب کے گروپ میں بریکٹ کرتے رہے۔ کچھ احباب نے اس کی کڑیاں افغانستان میں اس وقت روس، امریکہ اور پاکستان کے مابین جاری کشمکش سے جاملائیں اور قرار دیا کہ تمام کیمونسٹوں اور جدید تعلیم یافتہ لڑکیوں سے متعلق خیالات اصل میں ان دونوں طبقات کو معاشرے میں رسوا کرنے کی سازش ہے۔ کچھ لوگوں نے اس ناول میں حرام وحلال کے فلسفے پر ان کے دلائل اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جینیاتی مسائل کو بھی تحریر وتقریر کا خوب خوب نشانہ بنایا۔ خیر جہاں جہاں موقع ملا نقادان ادب نے زہر افشانی کے بھرپور جوہر دکھائے اور اس عظیم ناول کو تنگ نظری کی ٹکٹکی پر باندھ کر کینہ پروری کے چابک برساتے رہے۔

لیکن کیا اس طرح کی حرکتوں سے بانو قدسیہ کی عظمت پر کوئی آنچ آئی؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی کج بحثیوں نے آپا کے نوک قلم کو زیادہ پرزور اور ان کے خیالات کو اور ارفع بنا دیا۔ نتیجے کے طور پر ہم نے ان کو ناولٹ اور ناول کی اردو دنیا میں

ایک دن، پروا، موم کی گلیاں اور شہر بے مثال (چہار چمن)، حاصل گھاٹ، راجہ گدھ اور شہر لازوال کے ساتھ موجود پایا جبکہ ان کی کتابوں توجہ کی طالب' ناقابل ذکر، بازگشت، امربیل، کچھ اور نہیں، دست بستہ، سامان وجود اور آتش زیر پا سے ان کی افسانہ نویسی کے جوہر کھلے۔ ان کی خودنوشت راہ رواں بھی خاصے کی چیز ہے۔ حکومت نے تمغہ امتیاز جبکہ اکیڈمی آف لیٹرز نے کمال فن ایوارڈ سے نوازا اور بات جہاں تک پہنچی کہ بطور ادیب وہ اشفاق احمد سے بھی زیادہ معتبر قرار دی جانے لگیں۔ خاص طور پر جانوروں سے محبت اور ان کے بارے میں گہرا علم ان کی پہچان بنا۔ اس کا ثبوت ان کا شاہکار ناول راجہ گدھ ہے۔ جس میں مصنفہ نے کمال مہارت سے گدھوں کی سرشت کو بیان کرتے ہوئے ان لوگوں کیلئے ایک استعارہ بنا دیا جو رزق حرام میں زندگی کی آسائش تلاش کرتے ہیں۔ ناول کا نام بجائے خود خاصے کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں موم کی گلیاں میں انہوں نے جس وقیع انداز میں شہد کے چھتے کو ایک معاشرہ قرار دیتے ہوئے اس کے مکینوں کا احوال بیان کیا ہے یہ بھی ان کے سائنسی شعور اور جانوروں کے بارے میں ان کی معلومات پر شاہد ہے۔

علاوہ ازیں محبت، جنس، روحانیت اور مردانہ معاشرے میں عورت کا مقام ان کے خاص موضوعات ہیں، جن پر ان کے ناولوں اور افسانوں ہی نہیں ان کے ڈراموں کی بھی بنیاد استوار ہے۔ فٹ پاتھ کی گھاس، ہجرتوں کے درمیاں اور سورج مکھی جیسی شاندار کتابوں نے بھی انہیں ایک الگ پہچان بنانے میں مدد فراہم کی۔ اردو کے ممتاز ادیب اور صحافی محمود شام کے بقول بانو قدسیہ اور اشفاق احمد دونوں لیجنڈ تھے۔ جنہوں نے اردو ادب میں نئی جہتیں متعارف کرائیں اور نت نئے تجربات کیے۔ بانو قدسیہ کی زندگی میں پاکستان کی ثقافت، عام لوگوں کی زندگی، روحانیت، تصوف اور حیرتوں پر مبنی تجربات ملتے ہیں۔ انہوں نے علامتی انداز میں جاگیرداروں اور ظلم ڈھانے والوں کے خلاف بھی قلم اٹھایا، پاکستان کی نوجوان نسل ان پر نثار ہوئی اور اردو ادب میں ان کا کنٹری بیوشن بہت عمدہ تھا۔

اشفاق احمد کے دوستوں قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کے ساتھ بھی زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کا موقع انہیں حاصل رہا یہ تینوں شخصیات چونکہ تصوف کی طرف مائل تھیں لہٰذا بانو آپا کی زندگی اور تحریروں میں بھی تصوف اور صوفیانہ نظریات کی بازگشت موجود ہے۔ یہی وہ نقطہ جس نے انہیں صابر وشاکر شخصیت بننے میں مدد فراہم کی اور ان کی تحریروں کے ذریعے یہ پیغام ان کے قارئین تک پہنچا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے باوجود انہوں نے آخر

تک مشرقی اور فرمانبردار بیوی بنے رہنے کو فوقیت دی۔اسی لیے وہ ہمیشہ کہتیں کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں، اگر مجھ میں کوئی خوبی ہے تو وہ اشفاق احمد کا فیض ہے۔

ان کی تحریر کا ایک اہم نقطہ ان کی اسلام، کلچر اور زبان سے لازوال وابستگی ہے۔انہوں نے اپنی تحریروں کو معاشرے خاص طور پر نئی نسل کیلئے پیغام کا ایک ذریعہ بنایا۔وہ اس بات کو معیوب نہیں سمجھتیں۔ان کے نزدیک ایک ادیب کی خوبی یہ ہے کہ وہ براہ راست لوگوں کے دل میں اتر جائے اور معاشرتی اصلاح وفلاح میں اپنا کردار ادا کرے۔ان کے نزدیک ادب برائے ادب سے ادب برائے مقصد عظیم تر ہے۔وہ اس امر سے آگاہ تھیں کہ مغرب کے خواتین کی کلی آزادی کے نعرے تیسری دنیا کے لوگوں خاص طور پر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو ورغلانے اور انہیں اپنا آلہ کار بنا کر معاشرتی افراتفری پھیلانے کے بہانے ہیں۔وہ خواتین کو معاشرے کا سب سے فعال اور مہذب طبقہ تصور کرتی ہیں لہٰذا ان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں لیکن وہ ایسی تعلیم اور آزادی اظہار کی حامی نہیں جو ملحدانہ اور فاحشانہ تہذیب سے پھوٹتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ راجہ گدھ ہو یا کوئی اور تحریر انہوں نے نئی نسل کو خرافات سے بچا کر ایک صالح زندگی کی طرف مائل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اسی باعث تو مغرب کے خوشہ چیں ان سے ہمیشہ برسر پیکار رہے اور موت کے بعد بھی انہیں بخشنے کو تیار نہیں۔

دن ڈھل رہا تھا جب اسے دفنا کے آئے تھے
سورج بھی تھا ملول زمیں پر جھکا ہوا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عباس

حاصل گھاٹ: ایک مطالعہ

بانو قدسیہ اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔اہم اس حوالے سے کہ ان کا ناول ''راجہ گدھ'' بہت سے سوالات اٹھانے کے لیے مشہور ہے۔ان کے دوسرے ناول بھی اپنے موضوعات کے اعتبار سے کم اہم نہیں۔ایسا ہی ایک ناول ''حاصل گھاٹ'' ہے۔ناول میں بانو قدسیہ نے اس امر پر بحث کی ہے کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتا۔ہم جو مشرق کے پس ماندہ لوگ ہیں، خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے باشندے، ہمارے لیے مغرب اور خصوصاً امریکہ کی ترقی ایک خواب کی سی حیثیت رکھتی ہے۔خوابوں کی ایک ایسی دنیا ہے جس تک رسائی کی اکثر دل تمنا رکھتے ہیں۔امریکہ، جس میں ترقی کی انتہا پر پہنچی ہوئی قوم بستی ہے، ایک مثالی معاشرہ ہے جہاں ہمارے خیال میں سب انسان ترقی کے سرچشمے سے سیراب ہونے کی بنا پر خوش باش ہیں۔کوئی غم ان کے قریب نہیں پھٹکتا، ہر وقت موج میلے میں مشغول رہتے ہیں اور زندگی سے ہر ممکن طریقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ناول نگار نے امریکی معاشرے کی چیدہ چیدہ خصوصیات، ترقی کی وجوہات اور ترقی کا معیار اور انداز بتانے کے ساتھ ساتھ وہاں کے انسان کا جو اندرونی مشاہدہ پیش کیا ہے، اس سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ ترقی کی انتہا پر پہنچنے کے باوجود وہاں بھی انسان خوش نہیں ہے۔اس کی وجہ ترقی کی وہ قیمت ہے جو انسان کو ادا کرنی پڑتی ہے۔معاشی جدوجہد سے اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے چکر میں فرد کا معاشرے سے ربط ٹوٹ چکا ہے۔سماجی تفاعل بالکل ختم ہو کر یا معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔گویا رد جو قائم ہی ربطِ ملت سے ہوتا ہے، خود اپنی ذات کے کھونتے سے بندھا زندگی کے دائرے میں گردش کرتا رہتا ہے۔انسان اپنی تنہائی میں گم ہو گیا ہے، نہ اسے باہر سے وقت مل سکتا ہے اور نہ وہ کسی کو وقت دے سکتا ہے۔جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ صرف خود ہی ہے، خود اپنے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔کوئی اس کے درد کا مداوا نہیں کر سکتا نہ وہ خود کسی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔انسان کا انسان سے جو قلبی رشتہ قائم ہوتا ہے، وہ اپنا وجود، اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے اور فرد کو تنہا فقط اپنی ذات کے بھروسے پر جینا

پڑ رہا ہے۔ معاشرتی زندگی میں انسان، انسان سے کٹ جانے کی بنا پر (انسان جس کی تشکیل میں دوئی کی خواہش بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے) اپنی ذات کے اندر پنہاں دکھ اور یاسیت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

بانو قدسیہ امریکی فرد کی ذات زندگی کی اندرونی مشاہدہ پیش کرنے کے بعد اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہ سکتا، چاہے وہ ترقی کی کسی بھی سطح پر پہنچ جائے۔ اس کے اندر اضطراب کی کیفیت موجود رہتی ہے۔ ''امر بیل'' کے ایک افسانے ''سامانِ شیون'' میں بھی بانو یہی خیال پیش کرتی ہیں کہ انسان جتنا بھی آسودہ ہو، جتنا بھی خوشحال ہو، کبھی بھی اندر سے مطمئن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے خوشی کے ساتھ ساتھ غم کی سوغات نہ ملے۔ کسی بھی چیز کی قدر اس کی ضد کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر غم نہ ہو تو پھر انسان کو خوشی کی قدر بھی نہیں ہو سکتی۔ اس جگہ ناول نگار یہ خیال پیش کرتی ہیں کہ ہر وقت آسودہ رہنے والے لوگ بھی کسی غم، کسی روگ کے متلاشی ہوتے ہیں اور اگر انہیں بیرونی دنیا سے کوئی فکر، کوئی پریشانی نہ ہو تو پھر یہ اپنی ذات کے اندر کرب کی کوئی کیفیت پیدا کر کے لاشعوری طور پر اپنے لیے سامانِ شیون پیدا کر لیتے ہیں۔

مغرب کی اجتماعی ترقی اور فرد کی فرد کی انفرادی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی توڑ پھوڑ کے تجزیے کے ساتھ ساتھ ناول میں مشرق کی اجتماعی پسماندگی اور فرد کی انفرادی سطح پر نا آسودگی کا مطالعہ بھی جاری رہتا ہے۔ یہاں ناول نگار مشرقی معاشروں میں فرد کی گروہ سے چمٹے رہنے کی خاصیت پر بحث کرتی ہے۔ یہاں چونکہ فرد کا تعلق معاشرے سے انتہائی شدت کے ساتھ ہے، اس لیے معاشرہ فرد سے بھرپور وقت کا طلب گار ہے۔ فرد فرد سے تعلق قائم رکھنے پر مجبور ہے اور اسی مجبوری کی بنا پر وہ اپنے معاشی مسائل کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتا۔ (جیسا کہ ناول میں جہانگیر کی بیوی شاہدہ کا خیال ہے) یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں معاشرتی اقدار کا وجود تو سلامت ہے لیکن ہم معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں اور چونکہ فطری طور پر انسان اسی چیز کی طرف دیکھتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے ہماری نظریں مغرب کی معاشی ترقی پر ہی جمی رہتی ہیں جو کہ ہمارے سکون میں خلل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بھی انسان خوش نہیں رہ پاتا اور معاش اور معاشرے کے درمیان شٹل کاک بنے رہنے کی وجہ سے اپنے معاشی مسائل میں تن دہی کا مظاہرہ نہیں کر پاتا اور پھر اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ انسان رشتوں کو اپنی ترقی کی راہ میں حائل پا کر بالآخر ان رشتوں سے ہی متنفر ہو جاتا ہے۔

دونوں تہذیبوں کے حالات، روایات، اقدار اور فرد کی انفرادی صورت حال کا مطالعہ کرنے کے بعد بانو یہ نتیجہ سامنے لائی ہیں کہ انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ چاہے وہ معاشی ترقی کی انتہا پر کیوں نہ پہنچ جائے یا خواہ وہ رشتوں کے ساتھ جڑا رہ کر اپنی اقدار کا رکھوالا بن کے زندگی گزارے۔ تو پھر سکون کس چیز میں ہے؟ سوال کی اس نہج تک پہنچ کر بانو ناول کے مرکزی خیال کو واضح کرتی ہیں۔ اس خیال کے لیے وہ پورے ناول میں بنیاد تعمیر کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ نے دو چیزوں کے تقابلی جائزے پر بہت توجہ دی ہے۔ ایک ترقی اور دوسرے فلاح۔ ترقی کو اس نے معاشی ترقی کے طور پر لیا ہے اور فلاح کو سماجی بہبود یا روحانی ترقی کے معانی میں لیا ہے۔ وہ یہ بحث کرتی ہیں کہ ترقی جو کہ ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے، آخر اس کی انتہا پر بھی پہنچ کر انسان کیوں مضطرب اور بے چین رہتا ہے۔ کہیں اس کی وجہ سے تو نہیں کہ جسم کی سب آرزوئیں پوری کرنے کے چکر میں وہ روح کے تقاضوں کو فراموش کر دیتا ہے اور یہی روحانی نا آسودگی اس کی بے چینی کا باعث بنتی ہے۔ تو پھر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان کو روحانیت یعنی فلاح کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور سچی خوشی اور سکونِ قلب فلاح میں ہی مضمر ہے؟ اب یہاں فلاح کا تصور پیش کیا جاتا ہے کہ انسان صرف فلاح کی طرف مائل ہونے سے کسی حد تک سکون تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کے دل میں جو معاشی ترقی کی خواہش پنہاں ہے، وہ اسے کلی طور پر چین نہیں لینے دیتی۔ اسے زندگی میں کسی کمی کا احساس سا رہتا ہے اور وہ فلاح میں روحانی خوشی حاصل ہونے کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہو پاتا۔ کہیں اس کی وجہ تو نہیں کہ صرف روح کی طرف توجہ مرکوز رکھنے کی بنا پر انسان جسم کے تقاضوں سے غافل ہو جاتا ہے اور پھر یہی جسمانی تقاضے اسے مضطرب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب اخذ کیا جائے کہ انسان کو جسم کے تقاضوں کی طرف توجہ دینی چاہیے تو اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ وہاں بھی سکون میسر نہیں۔ تو پھر حتمی سکون کس چیز میں مضمر ہے؟ کون سی ایسا رستہ ہے جو آسودگی کی منزل تک پہنچاتا ہے؟ کون سا وظیفہ ہے جو انسان کو اطمینان بخشتا ہے؟

یہاں آ کر ناول نگار مرکزی خیال پیش کرتی ہے کہ سکون اور حقیقی خوشی کسی بھی انتہا میں نہیں مل سکتی۔ وہ ترقی کی انتہا ہو یا فلاح کی۔ شدت کسی بھی چیز کی ہو، ہمیشہ اضطراب کو جنم دیتی ہے۔ کثرت چاہے کسی بھی چیز کی ہو، سکون گنوانے کا موجب بنتی ہے، یعنی سکونِ قلب دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ پنڈولم کی طرح ایک انتہا سے دوسری طرف جھولتے رہنے سے

سکون نہیں مل سکتا بلکہ اعتدال کی راہ اپنانے سے مل سکتا ہے۔ انسان کو سچی خوشی صرف اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ جسم اور روح دونوں کے تقاضے پورے کرے۔ صرف ایک طرف توجہ کرنے سے انتشار اور ذہنی خلجان ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔

کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا، کی مثال کے ساتھ ناول نگار بتاتی ہیں کہ مشرق کی ترقی معاشرتی ہے اور مغرب کی معاشی۔ اگر ہم اپنی معاشرتی ترقی کو بالائے طاق رکھ کر یک دم اٹھ کر معاشی ترقی کی طرف دوڑنے لگیں تو پھر یوں ہے کہ ہمیں اپنی معاشرتی خصوصیات سے، اپنی اعلیٰ اقدار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ایسی خصوصیات اور اقدار جن کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں فرد کا فرد سے رشتہ اور انسان کا انسان پر اعتبار قائم ہے۔ محبت، خلوص، ادب، احترام، اخوت اور جذبۂ ایثار ان سب کو ترک کرنا پڑے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ ہم جو معاشی ترقی کی دوڑ میں اتنی دیر سے شریک ہو رہے ہیں، کبھی بھی ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتے، ہمیشہ دوسری قوموں کی تقلید ہی کرتے رہیں گے۔ اس دوڑ میں اس شدت، اس بے تابی سے حصہ لینے کا المناک نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم معاشرے پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے اپنی معاشرتی اقدار کے حوالے سے بھی انحطاط پذیر ہو جائیں گے اور پھر یہی ہوگا کہ ہم کوے کی طرح ہنس کی چال چلنے میں ناکام رہیں گے ہی، اس کے ساتھ اپنی چال بھی بھول جائیں گے۔ اس لیے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ ہم اپنی ان خصوصیات کو ساتھ لے کر چلیں جن کی بنا پر ہمارے معاشرے کا امتیاز قائم ہے۔ اندھا دھن ترقی کی گردان کرتے ہوئے اپنی تمام قابلِ تقلید روایات بھلا دینے سے کبھی بھی ترقی یافتہ لوگوں میں ہمارا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس تمام فکری جائزے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ناول کی روایت میں بانو قدسیہ کا ناول ''حاصل گھاٹ'' ایک عمدہ فکری اضافہ ہے جو ہمیں کچھ دیر کے لیے ہی سہی، سوچنے پر مجبور ضرور کرتا ہے۔

☆☆☆

عاصمہ روبینہ

بانو قدسیہ کے افسانہ ''کال کلیچی'' میں پرندوں کی علامات

بانو قدسیہ اُردو ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے جو ایک ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ ضرورت کے تحت بننے والی مصنفہ ادب کے ہر شعبے میں اپنے فن کی دھاک بٹھائیں گی۔ اگرچہ بانو نے اشفاق کے مقابلے میں نسبتاً کم لکھا ہے اِس کے باوجود اُس میں اِتنی پختگی اور فنی خوب صورتی ہے کہ وہ کہیں بھی اشفاق سے ایک قدم پیچھے دِکھائی نہیں دیتی ہیں۔

بانو کے ہاں ہمیں کسی ایک ہی فلسفہ یا موضوع کی چھاپ دِکھائی نہیں دیتی ہے بلکہ اِن کے ہاں موضوعات کے تنوّع کے ساتھ حیوانی تمثیلات یا حیوانی کرداروں اور کہانیوں میں بھی اِس قدر رنگینی ہے کہ خود اشفاق کے نقشِ قدم پر چلنے والی بانو ایک قدم آگے معلوم ہوتی ہیں۔ بانو اِن جانوروں کے کرداروں سے صرف محبت کا درس ہی کشید کر کے پیش نہیں کرتیں بلکہ ان کی مدد سے معاشرتی و معاشی مسائل اور اُن کے حل، خانگی زندگی کی جھلک، تصوّف، محبت، جنس ہر طرح کے موضوعات پیش کرتی ہیں۔ بانو کی کہانیاں پڑھنے کے بعد ایسا معلوم نہیں ہوتا ہے کہ وہ کہانی بیان کر رہی ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اِس زمین پر بسنے والے عام اِنسانوں کی یعنی خود ہماری اپنی زندگی کو بیان کر رہی ہیں۔ اِس سلسلے میں وہ اپنی کہانیوں میں مختلف پرندوں اور جانوروں کا انتخاب بھی کرتی ہیں اور اِس سلسلے میں اُنھیں اُن جانوروں کی خصوصیات اور عادات و خصائل کا عمیق مشاہدہ بھی ہوتا ہے۔

اپنے ادبی سفر کا آغاز بھی انھوں نے 'میر شکاری' کے قلمی نام سے کیا تھا اور شکاریات پر مضمون بھی تحریر کیے۔ نہ صرف اپنی کہانیوں میں جانوروں کے کردار پیش کیے بلکہ ''موم کی گلیاں'' جیسا معلوماتی ناولٹ بھی لکھا جس میں انسانی معاشرے اور مکھیوں کے معاشرے کی مکمل تصویر کشی کی۔ حیوانی تمثیلات پر مبنی بانو قدسیہ کے ناول 'راجہ گدھ' کا شمار بھی اُردو ادب کے نمایاں ناولوں میں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے مختلف افسانوں میں حیوانی تشبیہات کے اِستعمال سے اپنی کہانی کو جو خوب صورتی بخشی ہے اُس کا بیان لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اِن تشبیہات کو اگر ہم الگ کر کے مطالعہ کریں تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اِن تشبیہات میں ایک جانور ستان آباد ہے اور تشبیہات اِن افسانوں میں ایسے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے ہیں۔ یہ تشبیہات نہ صرف بانو کی لفظوں کی کاریگری بلکہ اُن کے عمیق مطالعے ومشاہدے دونوں کا پتہ دیتی ہیں۔

زیرِنظر افسانہ کال کلچی بھی اِسی تناظر میں لکھا ہوا ایک افسانہ ہے جس میں رنگ، نسل اور طبقاتی تضاد کو موضوع بنایا گیا ہے۔

کہانی کا آغاز ایک چڑیا گھر کے منظر سے ہوتا ہے، جس میں مختلف قسم کے جانور اور پرندے ہیں۔ راج ہنس کال کلچی سے اِتنی دیر چڑیا گھر سے غائب رہنے کی وجہ پوچھ رہا ہے۔ کال کلچی نے بتایا کہ وہ دربار صاحب گئی ہوئی تھی۔ سارس نے جب سنا کہ کال کلچی دربار گئی تھی تو اُسے کال کلچی پر بہت رشک آیا کیونکہ وہ خود ساری زندگی قید میں گزارتا ہے۔ دھنیش جو سب پرندوں میں سے کم گو ہے وہ اپنی لمبی چونچ کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ اُس کی بجائے افریقہ کے طوطوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن جب وہ کال کلچی کی بات سنتا ہے تو جھٹ جنگلے کے پاس آ کر اُس سے مختلف سوال پوچھنے لگتا ہے۔ کال کلچی بھی سنہری مچھلیوں کے ڈبے پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہاں جوتا مذہبی سکھوں کی حوالے کیا جاتا ہے۔ مچھلیوں کو مذہبی سکھوں کا نام سن کر تعصب کی بہت سی کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ بطخ کا بچہ جو تعلیم کا بڑا رسیا ہے لیکن قید کی وجہ سے اِس نعمت سے محروم ہے۔ وہ کال کلچی سے مذہبی سکھ کا مطلب پوچھتا ہے کال کلچی اُسے بتاتی ہے کہ سکھوں میں نچلی ذات، یا وہ لوگ جو کسی مذہب کو تبدیل کر کے سکھ ہوتے ہیں ملیچھ یا مذہبی سکھ کہلاتے ہیں۔ خارپشت نے جب یہ سنا تو خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی ملیچھ سمجھا جاتا تھا۔

بجو بتاتا ہے کہ ہمارے پاکستان میں تو کوئی ملیچھ نہیں ہے یہاں تو سارے محمود وایاز ایک صف میں نماز پڑھتے ہیں۔ کال کلچی بتاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو ملیچھ ہی سمجھتے تھے تبھی پاکستان بنا تھا۔ کبوتروں کا ایک خاندان جو قریب ہی بیٹھا تھا اظہارِ افسوس کرتا ہوا بولا کہ ایسے کیسے ہو سکتا ہی کہ جس اُمت کے پیغمبر نے سارے تضادات ختم کر دیئے اُسی کی اُمت ملیچھ ہے اور اُن کی توبہ توبہ کی پکار موجودہ پارک ہوٹل تک سنائی دینے لگی۔

کال کلچی اُڑ کر گڑھی شاہو کے ایک مکان پر جا بیٹھی جس پر ہذا من فضلِ ربی لکھا تھا اور یہ گھرانہ، رسم ورواج اور روایات کے حوالے سے بہت ہی مذہبی تھا۔ گھر کے افراد چالیس سے زیادہ ہوں گے اور بہت سفید ہونے کی وجہ سے خود کو سنو وائٹ سمجھتے تھے۔ گھر کی عورتیں زیادہ تر خانگی سیاست میں مصروف پائی جاتیں۔ اُن کے نزدیک دُنیا کے تمام گناہوں کا پردہ سفید رنگ میں تھا، جب کہ سیاہ رنگ کو دیکھ کر ہی اُن کو اُبکائی آنے لگتی۔ سیاہ شخص کو اِس گھر میں قابلِ نفرت سمجھا جاتا۔ حویلی میں بڑی امّاں کے بعد بڑی آپا کی حکمرانی تھی۔ حویلی میں جب خالہ مجیدہ کی زبانی پتہ چلا کہ رزاق میاں نے جھنگ میں دوسری شادی کر لی ہے اور اُس کی دُلہن سانولی ہے تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ باجی نے تو دِل ہی دِل میں اُسے طلاق دِلوانے یا زہر دینے کا ارادہ کر لیا۔ گھر کے بڑوں نے عزیز رِشتہ داروں کو فون کر کے رزاق میاں اور اُن کی فیملی سے قطع تعلق کا کہہ دیا۔ پہلے پہل رزاق میاں بھی ساجدہ کی رنگت سے خائف سے ہو جاتے لیکن جب اُس نے آصف کو اپنا گرویدہ بنا لیا تو رزاق میاں کے دِل میں ساجدہ کے لیے آپوں آپ جگہ بن گئی لیکن پھر اچانک رزاق میاں کا تبادلہ لاہور ہو گیا تو انھیں مجبوراً اپنے آبائی گھر آنا پڑا۔ رزاق اپنے آبائی گھر میں جانا نہیں چاہتے تھے لیکن لاہور میں رہائش کے مسئلے کی وجہ سے انھیں جانا پڑا۔ ساجدہ کی رنگت کی وجہ سے اُس کا شجرۂ نسب بھی مشکوک ٹھہرا اور اس کو گھر میں نوکروں کی سی حیثیت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کے حالات خراب سے خراب ہوتے گئے اور رزاق میاں کو اپنا گھر نہ مِلا لیکن انھی دِنوں میاں نواز نے لندن میں ایک عیسائی آئرش لڑکی سے شادی کر لی۔ گھر میں پھر بڑا واویلا ہوا لیکن جب نواز میاں اور میگی کی تصویریں آئیں تو مٹکی سے میگی کی گوری رنگت دیکھ کر سب خوش ہوئے اور بڑی تگ ودو کے بعد اُس کا نام ثمینہ تجویز پایا۔ کچھ مہینوں کے بعد نواز میاں جب میگی کو لے کر پاکستان آتے ہیں تو سب اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ اُس کے آنے سے پہلے گلبرگ میں کوٹھی لے کر بڑے سلیقے سے تیار کی جاتی ہے۔ پہلے پہل میگی اپنے انداز سے رہتی تھی پھر آہستہ آہستہ حویلی کے رسم ورواج، روایات میں بھی تبدیلیاں آئیں یوں میگی کے ساتھ میگی کا کلچر بھی آ گیا۔ لیکن ساجدہ اور میگی کے درمیان روزِ اوّل سے گلبرگ کی کوٹھی میں شفٹ ہونے تک ایک خلیج حائل رہی جو اُس وقت ٹوٹی جب میگی ماں بننے والی تھی۔ سارے گھر میں خوشی کا کوئی ٹھکانہ نظر نہ آتا لیکن زچہ بچہ کی حفاظت کے لیے قرعہ ساجدہ کے نام نکلا۔ ساجدہ کو ابھی گلبرگ آئے پانچ گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ حیدر آباد سے نواز کی موت کا تار آ گیا۔ میگی خبر سنتے ہی بے ہوش ہو گئی اور جب

اُسے ہوش آیا وہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میگی کو جب بھی ہوش آتی وہ ایک ہی دُعا کرتی کہ ہولی کرائسٹ بے بی میرے جیسا ہی ہو۔ بے بی واقعی ہی انگلش رسالوں کا ماڈل لگ رہا تھا۔ بگ باجی اور اماں بہت دُکھی تھی لیکن بے بی کو دیکھ کر خوش بھی تھی اور انھوں نے میگی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی لیکن میگی بضد تھی کہ جس کے لیے وہ یہاں تھی وہی نہیں تو پھر وہ بھی یہاں نہیں رہ سکتی اور وہ اپنا بے بی بھی ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتی کیونکہ وہاں اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہونا سب اُس کو کالا کہیں گئے اور تعصب کریں گے۔ بے بی کی پیدائش کے پورے پندرہ دِن کے بعد جب ساجدہ میگی کو ایئرپورٹ چھوڑنے گئی تو میگی بہت دُکھی ہو رہی تھی اور ساجدہ سے بولی ایسا نہیں ہے کہ میرے اندر ماتا کی کمی ہے لیکن بے بی اگر مجھ پر ہوتا تو اور بات تھی لیکن یہ تو پورے کا پورا نواز پر ہے۔ بے بی کو بے تحاشا چومتے ہوئے میگی نے بے بی ساجدہ کی حفاظت میں دے دیا۔

کال کلچی یہ سارا واقعہ چڑیا گھر کے سارے پرندوں اور جانوروں کو سناتی ہے تو سارس، بطخ، بندریا، چندرہنس راج، دھنیش، شیرنی، میکاؤ، کبوتر، چینی فینزنٹ کی مادہ نے اُس کی بات پر یقین نہ کیا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو صرف سیاہ رنگت کی وجہ سے چھوڑ سکتی ہے۔ سارے چڑیا گھر میں کال کلیجی کے لیے جھوٹی جھوٹی کی صدائیں بلند ہونے لگیں لیکن یہ سب سننے کے لیے کال کلچی وہاں موجود نہیں تھی اُس کے تو اپنے بچے کسی اور کے گھونسلے میں پرورش پا رہے تھے۔

کال کلچی بانو کا ایک بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس میں انھوں نے ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے طبقات اور رنگ و نسل کے بارے میں لوگوں کے تعصب کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانے کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ چڑیا گھر کا منظر ہے جس میں مختلف پرندے اور جانور اکٹھے رہ رہے ہیں۔ باقی سب جانور قید میں ہیں جب کہ کال کلچی آزاد ہے۔ سب پرندے اور جانور اُس سے اِتنی دیر چڑیا گھر سے باہر رہنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو وہ بتاتی ہے کہ وہ دربار صاحب گئی تھی۔ کہانی کا آغاز ہی بانو اس قدر خوب صورت انداز میں تانا بانا بنتے ہوئے کرتی ہیں کہ پہلے وہ اِس نسلی تضاد کے بارے میں جانوروں سے باتیں کرواتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ ہمارے پاکستان کی بنیاد اِسی بات پر تھی کہ تمام مسلمان برابر ہیں اور اِن کا الگ وطن ہونا چاہیے کیونکہ مسلمان سب ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں اِن میں کوئی اُونچے طبقے یا نچلے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ جب کہ برصغیر میں ہندو، مسلمانوں کو ملیچھ تصوّر کرتے تھے

اور اِن سے برا سلوک کرتے تھے۔

''اچھا ہی ہوا جو اپنا پاکستان بن گیا۔ میں تو خیر اِسی پنجرے میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن میری ماں بتایا کرتی تھی کہ پہلے وہ ہندو بن مانس مسلمانوں کو ملیچھ سمجھا کرتے تھے۔''(۱)

بانو اصل میں اِس افسانے میں بتانا چاہتی ہیں کہ مسلمان تو اِسی نسلی تضاد کی وجہ سے ہندوؤں سے الگ ہوئے تھے اور رسولِ اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسے عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور اِسی پیغمبر کی اُمت کیسے ملیچھ ہو سکتی ہے۔ کال کلچی کہتی ہے کہ ہندوستان کو ملیچھ تصوّر کرتے تھے لیکن خدا کا شکر ہے ہم ایک آزاد اور الگ وطن میں رہتے ہیں جہاں سب برابر ہیں۔ بانو نے کسی بھی چیز کو واضح انداز میں براہِ راست بتانے کی بجائے حقائق کو ہلکے سے طنز کی صورت میں پیش کیا ہے۔ پہلے تو جانوروں کی زبانی بیان کروایا ہے کہ ہم آزاد ہوئے اور وہ اِتنے معصوم ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ اب پاکستان میں سب برابر ہیں اور سب محمود و ایاز برابر رہ رہے ہیں اور ایک صف میں نماز پڑھتے ہیں۔

''بجو کو خار پشت سے بڑی چڑ تھی۔ چلّا کر بولا۔۔۔ ہاں ہاں تو اپنی فیلسوفی بگھار لے ارے کوون۔۔۔ کس زمانے کی باتیں کر رہا ہے تو یہاں اپنے پاکستان میں کوئی ملیچھ ہے بتا؟ وہ ہندوستان کی بات کر رہی ہے تو پاکستان کی بانی لے بیٹھا۔ کانٹوں کے سوا تجھ میں اور ہے کیا؟ یہاں ہمارے پاکستان میں تو سکھ کی بانسری بجتی ہے۔ محمود و ایاز ایک صف میں نماز پڑھتے ہیں۔ یہان کون ملیچھ ہے بول رے۔ ایک رسول کے ماننے والے بستے ہیں یہاں۔۔۔ یہاں کیسے کوئی ملیچھ ہو سکتا ہے؟''(۲)

لیکن پرندے چونکہ بھولے اور معصوم ہیں اُن کو کچھ معلوم نہیں ہے لیکن پھر دوسری کہانی اِس کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے جو ایک ایسے خاندان کی ہے جو اپنی روایات، رسم و رواج کے حوالے سے بڑے مذہبی اور اللہ رسول والے ہیں لیکن یہیں سے بانو بتاتی ہیں کہ لوگ کیسے دوہری زندگی جیتے ہیں ایک طرف احکامِ ربی اور سنتِ رسول پر عمل کرتے ہیں، دوسری طرف وہ کسی بھی شخص کی اچھائی یا برائی کا اندازہ اُس کی سفید رنگت سے کرتے ہیں جب کہ سیاہ فام سے انھیں شدید نفرت ہے۔

اِس کی مثال جو کچھ اِس طرح پیش کی کہ رزاق میاں جھنگ میں دوسری شادی کر لیتے ہیں تو سب اُس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور سیاہ فام ہونے کی وجہ سے ساجدہ کا شجرۂ نسب بھی مشکوک قرار دے دیا جاتا ہے۔

''اصل وجہ نزاع تو ساجدہ کی جلد تھی لیکن بہت جلد جملہ خواتین اِس نتیجے پر پہنچیں کہ ساجدہ مکمل و ناسیتی ہے۔ بھوا کا ساگ کن ساگوں میں؟ بیچاری کا لمبا چوڑا کنبہ نہ تھا۔ فوراً حسب نسب بھی مشکوک نکلا، بیچاری نے کئی مرتبہ بتایا کہ وہ راجپوت ہے لیکن ماں نے شجرۂ نسب نکاح میں دیا نہ تھا کہ گھر والیاں اِس کی بات مان لیتیں۔ بیچاری کا حسب نسب بھی مشکوک نکل آیا۔ کچھ دولت کی پٹاری بھی ساتھ نہ تھی کہ اُن کا منہ بند کر سکتی۔ اِس گھر کی ساری چندر بنسی ناریں اپنے اپنے پلّو بچا کر چلنے لگیں اور بیچاری ساجدہ سب سے کٹ کر رہ گئی۔''(۳)

لیکن تھوڑے عرصے بعد جب نواز میاں لندن میں ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں تو سب میگی کی سفید رنگت کی وجہ سے نواز میاں کا گناہ معاف کر دیتے ہیں اور میگی کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، پھر مکافاتِ عمل ہوتا ہے اور نواز میاں کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے لیکن میگی اُس کو نواز کی موت کے بعد سیاہ فام ہونے کی وجہ سے لے کر نہیں جاتی۔ اِس حویلی میں ساجدہ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے اور پھر انھی دیوتاؤں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے کہ ساجدہ جو بہت غریب تھی جس کا شجرۂ نسب یا خاندان کا پتہ نہیں تھا۔ میگی اپنے بیٹے کو اُسی ساجدہ کے حوالے کر کے جانے پر مجبور ہوتی ہے۔

''میں اِس سیاہ بچے کو وہاں کیسے لے جاؤں؟ بگ باجی ذرا اِس کی رنگت دیکھیے۔ یہ تو پورا نواز ہے نواز۔ وہی رنگ، وہی آنکھیں، وہی بال۔۔۔ مائی کرائسٹ۔ میں آپ لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ ہمارے لوگ کیسے تنگ نظر ہیں۔ وہ کسی کالے آدمی سے دِلی محبت نہیں کر سکتے۔ کالے اور سفید کے درمیان ہمیشہ ایک دیوار حائل رہتی ہے۔ مَیں اِس بچے کو ان جلادوں کے سپرد کیسے کر سکتی ہوں بگ باجی؟ کیسے کیسے کیسے؟''(۴)

یہ ساری کہانی جب کال کلچی چڑیا گھر میں بتاتی ہے تو کوئی بھی اِس بات سے اِتفاق

نہیں کرتا کہ کوئی ماں اپنے بچے کو سیاہ رنگت کی وجہ سے چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ سب جانور کال کلچی کو ہی برا بھلا سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خود ایسا کرتی ہے کہ کسی دوسرے کے گھونسلے پر قبضہ کر کے اُس میں اپنے بچے پیدا کر کے چلی جاتی ہے۔ افسانہ میں دراصل میگی کو کال کلچی قرار دیا گیا ہے کیونکہ کال کلچی اکثر کوؤں کے گھونسلوں پر ہی قبضہ کرتی ہے تو اِس لحاظ سے ساجدہ کو کوّے سے تشبیہ دی گئی ہے جو اُس کا بچہ پالنے پر راضی ہو گئی۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷

۲۔ ایضاً، ص ۷۵۔۷۴

۳۔ ایضاً، ص ۸۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۳

☆☆☆

ڈاکٹر مسرت بانو

''آواز دوست'' ایک ہمہ جہت ادبی فن پارہ

''آواز دوست'' مختار مسعود کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو شاہ بیگم اور شیخ عطا اللہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا اور اب تک اس کے تقریباً تیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔۲۳۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں صرف دو مضامین شامل ہیں جو ''ہر چہ بقدر قامت کہتر، بقیمت بہتر'' کے مصداق علم و ادب کی دنیا میں بقائے دوام کے حامل ہیں۔ان مضامین کے عنوانات ''مینار پاکستان'' اور ''قحط الرجال'' ہیں۔اگرچہ مختار مسعود نے خود اپنی ان یادداشتوں کے لیے مضمون کی اصطلاح استعمال کی ہے مگر فنی اعتبار سے انہیں مضمون نہیں کہا جا سکتا۔ان میں مضمون کی سی آغاز، نفس مضمون اور اختتام پر مبنی ترتیب و تنظیم اور خشک منطقی استدلالیت نہیں ہے۔ انہیں مقالہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مضامین مقالات کی طرح طویل ہیں مگر ثقیل نہیں ہیں۔ان میں انشائیے کی سی شگفتگی پائی جاتی ہے مگر یہ انشائیے کی طرح ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود، بے مقصد، غیر منظم اور غیر مربوط نہیں ہیں۔ان میں ایک شعر کا سا تناسب اور آہنگ پایا جاتا ہے، جس میں ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔خیالات کا ایک منہ زور دھارا ہے جو اپنی ہی رو میں بہتا چلا جاتا ہے اور حکمت کے موتی صفحۂ قرطاس پہ بکھرتے جاتے ہیں۔مختار مسعود آنکھوں دیکھے واقعات کو افسانوی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ وقت کی طنابیں سمٹ جاتی ہیں، ماضی حال سے ہم آغوش ہوتا اور حال کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ جھلک دکھاتا نظر آتا ہے۔موضوع اور ہئیت کے اعتبار سے یہ کتاب آپ بیتی، خاکہ نگاری، داستان، سفر نامہ، شخصیت نگاری، منظر کشی اور افسانوی خوبیوں کو اس طرح ہم آمیز کیے ہوئے ہے کہ آپ بیتی جگ بیتی نظر آتی ہے، سفر نامہ، سفر زندگی کی داستان بن جاتا ہے اور حقائق زندگی، افسانے کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

''آوز دوست'' کا موضوع ہماری ملکی قومی تاریخ ہے مگر اس میں مختار مسعود نے مذہب، فن تعمیر، شخصیت نگاری، اخلاقی اقدار اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔انہوں نے قیام پاکستان سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان تک، ہماری قومی اور ملّی

تاریخ کے عروج و زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔وہ جب رہبروں کو رہزنوں کا روپ دھارتے اور تعمیر کرنے والوں کو تخریب کا پیش رو بنتے دیکھتے ہیں تو ملی ہمدردی اور قومی جذبے سے سرشار، ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اپنے احساسات و جذبات کو الفاظ میں ڈھالتے ہیں اور ان کے دل کی آواز ''آواز دوست'' کا روپ دھار لیتی ہے۔پہلا مضمون ''مینار پاکستان'' ہے جس کا آغاز مینار قرارداد پاکستان کی مجلس تعمیر کی صدارت سے ہوتا ہے۔اس مجلس کے دوران مصنف کا ذہن جارج برنارڈ شا کے مقولے پر غور کر رہا ہے:

> ''وہ مقام جہاں خواہش قلبی اور فرض منصبی کی حدیں مل جائیں، اسے خوش بختی کہتے ہیں۔'' (ص ۱۱)

اور مصنف اپنی خوش بختی پر نازاں ہے کہ اسے اس بابرکت مجلس کی صدارت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔''مینار پاکستان'' میں مختار مسعود نے فلیش بیک کی ڈرامائی تکنیک کو نہایت خوبی اور خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔لکھتے لکھتے ان کا ذہن ماضی کی طرف پلٹ جاتا ہے اور پھر ماضی کے بے شمار واقعات اور مناظر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کا قلم رواں ہو جاتا ہے۔ان کا ذہن مسلسل سوچتا رہتا ہے اور فکر رسا پیہم گردش کرتی رہتی ہے اور علم و حکمت کے نئے نئے دروازے وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور قاری ایک ہی موضوع کے دائرے میں مقید ہونے کے باوجود تاریخ، ادب، فلسفہ، حکمت، مذہب اور فن کی ان گنت دنیاؤں کی سیر کرتا چلا جاتا ہے۔مینار پاکستان کو پیش منظر میں رکھ کر مختار مسعود نے مینا رسازی کی تاریخ کو کھنگال ڈالا ہے اور دنیا بھر کے نامور میناروں کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔مینار کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مینار کی ابتدائی صورت دفاعی ضرورت کے تحت وجود میں آئی، پھر اس کی علامتی حیثیت قائم ہوئی،، اس کے بعد یہ دین کا ستون بنا اور آخر کار نشان خیر کے طور پر بنایا جانے لگا۔مینار قرارداد ،ان ساری حیثیتوں پر محیط ہے۔یہ نظریاتی دفاع کی ضرورت، تحریک آزادی کی علامت، دین کی سرفرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا نشان خیر ہے۔'' (ص۔۱۳)

مینار پاکستان کے پس منظر میں مختار مسعود دنیا بھر کے میناروں کو یاد کرتے ہیں۔وہ اپنی

تاریخ کے سنہرے دور میں تعمیر کیے گئے میناروں بشمول قیروان کی مسجد کا بھاری بھرکم مینار، اس کی تقلید میں بنایا گیا قاہرہ کا مینار، قرطبہ میں عبدالرحمٰن اول کا بنایا ہوا مینار، جرقورغان میں ساڑھے آٹھ سو سالہ پرانا مینار، سمرقند میں بی بی خانم کا مٹی سے بنوایا ہوا مینار، میناروں کے شہر خیوہ کی جامع مسجد کا مینار، مدرسہ قلی خان کا مینار، مدرسہ امین خان کا مینار اور خواجہ اسلام کے ''کم عمر مینار'' کو یاد کرتے ہیں۔ بخارا کے مینار کلاں، غزہ کی جامع مسجد کا مینار، الخلیل کا مینار اور قطب مینار سے ہوتے ہوئے پاکستان میں منوڑہ کے روشن مینار، سکھر کے معصوم شاہ کا مینار، لائل پور کے چوک مینار اور گڑھی شاہو کے کوس مینار تک آتے ہیں اور پھر مغلوں کے باب میں بابر کے کلہ مینار جو اس نے رانا سانگا سے لڑائی کے بعد دشمنوں کے سروں سے تعمیر کرایا تھا، اور اورنگزیب کے دور میں دولت آباد میں فتح مینار اور عالمگیری مسجد کے میناروں کا ذکر کر کے پھر یک بیک مینار پاکستان کی طرف آتے ہیں اور تاریخ کو میناروں کی تاریخ سے ہمدوش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں مگر ان کے درمیان یہ ذرا سی مسافت، جس میں سکھوں کو گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا ان تین گم شدہ صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی، جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو، اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آئے اور زندگی سے محبت ہو جائے، تو صدیاں یوں ہی گم ہو جاتی ہیں۔''
> (ص۔۲۲۳)

پس وہ آنکھیں بند کرتے ہیں اور ۲ جنوری ۱۸۷۷ء کی اس بابرکت گھڑی میں پہنچ جاتے ہیں جب علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا اور پھر فلیش بیک تکنیک کے ذریعے تاریخ کے اس پرجوش اور جذباتی دور کی تصاویر کو الفاظ کی شکل میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس کی منزل مقصود پاکستان کا قیام تھا۔ یہ مضمون ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جس میں تاریخ کے نشیب و فراز بھی ہیں اور معلومات کا بیش قیمت خزانہ بھی۔ قومی ہمدردی اور ملّی شعور اس مضمون کے ایک ایک لفظ سے جھلکتا دکھائی دیتا

ہے۔ مختار مسعود کا انداز فکر و بیاں ایک رومان پرست کے جیسا ہے جسے اپنے ماضی سے شدید محبت ہے۔ مگر وہ ماضی کی مدح سرائی کرتے ہیں، نہ محض مرثیہ خوانی۔ وہ تو ایک باشعور فنکار اور ایک مخلص مفکر کی طرح ماضی کی شاندار روایات اور اسلاف کے روشن نقوش کو حال کی تیرگی مٹانے کا ذریعہ بناتے ہیں اور ٹھوس حقائق کی روشنی میں ملکی زوال، اخلاقی پسماندگی اور قومی تنزل کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں۔

''قحط الرجال'' اس کتاب کا دوسرا مضمون ہے جو ۱۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''مینار پاکستان'' سے طوالت میں چھ گنا بڑے اس مضمون میں سوانح نگاری، انشائیہ نگاری، شخصیت نگاری، یادداشت نویسی اور تحقیق و تنقید کے مختلف رنگ اس طرح باہم گتھے ہوئے ہیں کہ اپنے انفرادی خصائص رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں اور انہیں الگ الگ کرنے کا خیال ہی عبث معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں بنیادی اہمیت مختار مسعود کی آٹو گراف بک کو حاصل ہے جسے انہوں نے شخصیت نگاری کے لیے ''پلاٹ'' کے طور پر استعمال کیا ہے۔ نیلے رنگ کی اس آٹو گراف بک میں چینی مسلمان عالم محمد ابراہیم شا کیوچن نے ۱۳ دسمبر ۱۹۳۸ء میں اولین دستخط کیے تو مختار مسعود پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پھر انہوں نے عمر عزیز اپنے والد کی نصیحت کے مطابق کہ ''جاؤ نگہ انتخاب کو کام میں لاؤ، بڑے آدمی زندگی میں کم اور کتابوں میں زیادہ ملیں گے۔'' ایسے بڑے آدمیوں کی تلاش میں گزاری اور نگہ انتخاب محض تیرہ اصحاب پر پڑی جن میں نواب بہادر یار جنگ، مولانا حسرت موہانی، ای۔ ایم۔ فارسٹر، ٹائن۔ بی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، نواب بھوپال حمید اللہ خان، مولانا ظفر علی خان، راجا صاحب محمود آباد، یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر اوتھانٹ، قائداعظم محمد علی جناح، سروجنی نائیڈو اور مس فاطمہ جناح شامل ہیں۔ مختار مسعود کی آٹو گراف بک گویا ایک مقدس کتاب ہے جس میں وہ دستخط لینے سے پہلے شخصیت کو خوب ٹھوک بجا کر دیکھتے ہیں اور جو ان کے قائم کردہ معیار پر پورا نہ اترے تو وہ اس کے ظاہری مقام و مرتبے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ شخصیت کے باطن میں جھانکتے ہیں اور اگر انہیں اس میں کوئی روشنی، کوئی بصیرت، کوئی پسندیدہ اخلاقی قدر نظر آئے تبھی اس کے سامنے اپنی آٹو گراف بک رکھتے ہیں۔

یہ مضامین مضمون آفرینی، تخیل کی بلند پروازی، نکتہ آفرینی، بلند آہنگی، دقیقہ سنجی، وصف نگاری، دلکش تشبیہات اور جدت تراکیب کی بدولت اپنے اندر قصیدہ نگاری کا سا حسن رکھتے ہیں

۔جب وہ کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو جس طرح اردو اور فارسی قصائد کی تشبیب میں مضامین کی کثرت، معنی آفرینی اور ندرت بیان کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، بالکل اسی طرح مختار مسعود بھی بات سے بات پیدا کرتے جاتے ہیں اور تاریخ وسیاست، اخلاق وحکمت، مذہب وفلسفہ، ادب وفن اور فکر وتخیل کے امتزاج سے وہ رنگارنگی پیدا کرتے ہیں کہ ان تمام علوم کی ایک ہم رنگ کائنات دلکشی اور نور بکھیرتی نظر آتی ہے۔افکار وخیالات کا ایک منہ زور دھارا ہے جو بنار کے سبک رفتاری کے ساتھ بہتا چلا جارہا ہے۔پھر جس طرح ایک عمدہ قصیدے کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ شاعر تشبیب کے بعد مدح سرائی کی طرف آنے سے پہلے ایک دو شعر ''گریز'' کے لاتا ہے تاکہ بات سے بات نکلتی محسوس ہو اور قاری کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ شاعر تشبیب کے بعد مدح کی طرف آ گیا ہے، بالکل اسی طرح مختار مسعود واقعات وخیالات کی کڑی سے کڑی ملاتے چلے جاتے ہیں اور ایک شخصیت کے ذکر سے دوسری شخصیت کے بیان کو ایسے نکالتے ہیں کہ قاری کو خفیف سا احساس بھی نہیں ہوتا کہ موضوع سخن تبدیل ہوگیا ہے۔ایک شخصیت کے ذکر کے ٹوٹتے ہوئے سرے سے دوسری شخصیت کا ذکر یا خیال کی نئی ڈور کا سرا اچانک یوں آن ملتا ہے کہ اس پیوند کا بال برابر نشان بھی نظر نہیں آتا ۔یوں ''قحط الرجال'' جو کہ چودہ نثر پاروں پر مشتمل ہے، بظاہر ایک ہی فن پارہ محسوس ہوتا ہے۔شخصیت نگاری کے ضمن میں وہ شخصیت کی ذاتی خوبیوں، نیکی وبزرگی، شرافت ونجابت، ہمت وجرات، علم وعرفان، حیاداری ووضع داری اور اخلاص وحب الوطنی کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ان کی فکر رسا برابر کام کرتی رہتی ہے اور معمولی اور روزمرہ کے مشاہدے کی چیزوں میں سے بھی حکمت اور دانائی کے پہلو نکال کر سامنے رکھ دیتی ہے۔مثلاً چینی عالم کے، چینی رسم الخط (اوپر سے نیچے کی طرف) میں دیئے گئے آٹوگراف کو دیکھ کر کہتے ہیں:

> ''اس چینی پروفیسر نے چینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ سطریں اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہیں۔حیرت اس وقت دور ہوئی جب یہ سمجھ میں آیا کہ ہر اچھی بات الہامی ہوتی ہے اور الہام نازل ہوا کرتا ہے۔'' (ص۔۴۹)

مختار مسعود کے یہ مضامین شخصیت نگاری کی تمام خوبیوں کے حامل ہیں۔ان سے نہ صرف شخصیت کے کردار وخدمات نمایاں ہوتی ہیں بلکہ وہ ایک ماہر خاکہ نگار کی طرح شخصیت کی ظاہری خوبیوں، لباس، حلیہ اور عادات واطوار کو بھی مختصر مگر جامع انداز میں بیان کرتے ہیں کہ

شخصیت کی قلمی تصویر صفحہ قرطاس پہ ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے۔سروجنی نائیڈو کا حلیہ ملاحظہ ہو، جزئیات نگاری کی خوبی نمایاں ہے:

> ''دبلی پتلی، بوٹا قد، تنگ دہن، آنکھیں کشادہ اور روشن۔بالوں میں گھنگھر ہیں اور چھوٹا سا جوڑا گردن پر ڈھلکا ہوا ہے۔جوڑے میں جڑاؤ پھول ہیں اور گلے میں موتیوں کا ہار۔بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں بڑی سی انگوٹھی ہے، ساڑھی کا پلّو کاندھے پر کلپ سے بندھا ہوا ہے۔'' (ص۔۱۷۰،۱۶۹)

اس مضمون میں مختار مسعود کی تنقیدی بصیرت بھی دکھائی دیتی ہے۔انہوں نے مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی کے کلام پر جو تنقیدی تبصرہ کیا ہے، وہ ان کی شعر فہمی اور تنقیدی صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اسی طرح انہوں نے ٹائن ۔بی کی کتاب ''تاریخ کا ایک مطالعہ'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہزاروں صفحات اور دس جلدوں پر مبنی اس کتاب کا لب لباب اس خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ نہ صرف ٹائن۔بی کے فلسفہ تاریخ کو چند صفحات میں سمو دیا ہے بلکہ ادب اور تاریخ کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔

مختار مسعود کا شمار اردو کے صاحب طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔یہ وہ اسلوب ہے جس کے لیے کہا گیا تھا کہ "Style Is The Man Himself"۔یہ بہت ہی شاندار اسلوب بیان ہے جس میں کلاسیکیت کا وقار بھی ہے اور رومانیت کی چاشنی بھی۔الفاظ وتراکیب کی ندرت اور تشبیہات کی دلکشی کے ساتھ اردو، فارسی اشعار اور قرآنی آیات نے اسے ایک ملکوتی حسن عطا کیا ہے۔مختصر ترین الفاظ میں وسیع تناظرات کو پیش کرنا مختار مسعود کا کمال فن ہے۔ان کے ایک ایک جملے میں فکر انگیزی کی کئی جہتیں وا ہوتی ہیں۔مختصر یہ کہ موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی کی بدولت یہ کتاب ادب کی دنیا میں ایک لازوال فن پارے کا درجہ رکھتی ہے۔

☆☆☆

شکیلہ پروین

منظور راہی کے افسانے ''عظیم لیبارٹری'' کا تنقیدی جائزہ

تخلیق ایک ایسا قرینہ ہے جس نے کائنات کو حسن اور زندگی کو جلوہ ہائے صد رنگ سے ہم کنار کیا ہے۔ زندگی کے اپنی جلوؤں میں سے ایک جلوہ جذبوں کی تفہیم ہے اور ادبی تخلیق اس کے اظہار کا جزو اوّلین ہے۔ چنانچہ جب تخلیق کی بات ہوگی تو تخلیق کار بھی ضرور زیر بحث آئے گا۔ چاہے تخلیق کار نثر نگار ہو یا شاعر تخلیق نظم و نثر ہر دور میں اپنے اپنے انداز سے زندگی اور انسانی معاشرت میں بھرپور طور پر اثر انداز ہوتی آئی ہیں۔

منظور راہی بھی ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں جو اپنی افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے باعث زندگی کے معاشرتی، سماجی اور تہذیبی خلاؤں میں اپنی تخلیقات کے ذریعے معنوں کی تلاش اور نئے مفاہیم کی کھوج میں مصروف نظر آتے ہیں گلزار چوہان، منظور راہی کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''ہمارے پاکستان میں پڑھے جانے والا اور پھیلنے والا بہت سا علم و ادب فٹ پاتھ مارکیٹ کا مرہونِ منت ہے۔ آپ سے کیا پردہ ہمارے اپنے علم و ادب کا مٹھی بھر خزانہ بھی فٹ پاتھ پر بکھرے ہوئے انباروں سے اکٹھا کیا ہوا ہے جس میں منظور راہی کی کارکردگی کا بڑا عمل دخل ہے کہ وہ کسی ماہر سیاست دان کی طرح جس کا ہاتھ ہر وقت نبض پر ہوتا ہے اور وہ حالات کے دور سے سب کچھ پڑھ لیتا ہے۔''[۱]

اب تک منظور راہی کے اُنتیس افسانے معرضِ اشاعت میں آ چکے ہیں جن میں سے ۲۳ افسانے ان کے افسانوی مجموعہ ''بانجھ موسموں کا سفر'' میں شامل ہیں جب کہ ۶ افسانے مختلف اوقات میں رسالہ کا ہولک نقیب کے مختلف شماروں میں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر ان افسانوں میں ۲۵ اُردو زبان میں لکھے گئے ہیں اور ۴ پنجابی زبان میں ہیں۔ منظور راہی کی کتاب ''بانجھ موسموں کا سفر'' پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام ہی ہر افسانے میں اپنی معنویت شامل کئے ہوئے ہے۔

ان افسانوں میں ایک ایسا خلا موجود ہے جو زندگی میں جا بجا وسیع ہو رہا ہے۔ منظور

راہی کے تمام افسانے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے جس طرح اس کی ایک ایک سطر سے شہر کے بدہیت ہوتے چلے جانے کا احساس تقویت پاتا ہے۔ انسان تو انسان، ظاہر اور باطن کی ہر بگڑنے کی نہیں ان کی بدہیت ہونے اور مدینت سے میدان حشر کی انتشاریت کی طرف ڈھلکنے کی کتھا بیان کرتی ہے۔ ذکاء الرحمٰن منظور راہی کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''منظور راہی کو میں نے اس لیے افسانہ نگار کہا کہ اس نے محض کہانیاں بیان نہیں کی بلکہ کہانی کو اپنی فکریات کی سواری بنایا ہے۔''[۲]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''منظور راہی کہانی کاروں کے ہجوم میں افسانہ نگار بہت تھوڑے ہیں بھاگ نہ جانا۔''[۳]

''عظیم لیبارٹری'' منظور راہی کے افسانوں میں سے ایک ہے جس کی تعمیر کسی نہ کسی ایسے حادثے پر کی ہے جو انسانی روابط کے ڈھانچے کو بہت دیر اور دور تک متاثر کرتا ہے۔ منظور راہی چونکہ زیادہ تر افسانوں میں گھریلو زندگی کے مسائل سے عالمی نوعیت کے مسائل اور سیاسی و معاشی تفریق سے مذہبی و سماجی تفریق غرض زندگی کے متنوع دائرے ان کے ہاں کہانی کے روپ میں ڈھلتے نظر آتے ہیں اس افسانے میں بھی منظور راہی نے اردگرد کی زندگی کا تجزیہ مخصوص نظریاتی اپج کے ساتھ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی معاش، سیاست، مذہب، تہذیب اور معاشرت غرض ہر حوالے سے مارکسی سوچ اور نظریے کو بھی اپنایا ہے۔ کیونکہ آج کل معاشرے میں ہر دوسرے دن حکمران بدل رہے ہیں وہ اپنی سوچ و خیال کے مطابق عوام پر مختلف تجربات کرتے ہیں۔ یہ افسانہ عظیم لیبارٹری بھی ایسے ہی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بہت سے کردار شامل ہیں مگر مرکزی رول مصنف کا ہے جو حالات کے جبر ہونے کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ یہاں ایک ایسی تجربہ گاہ موجود ہے جس میں سب لوگوں کو لوہے کی موٹی تار سے بندھا گیا ہے جو چیخ چیخ کر اپنی وفاداری پر جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اس موٹی تار پر لٹکنے والوں میں مصنف بھی شامل ہے۔ اس لیبارٹری میں روز تجرکار چھپ کے تجربہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تجربہ کار مصنف کو کچھ نہیں کہتے شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر تجربہ کرنے سے پہلے ہی وہ اپنا تجربہ کر چکا ہو۔ دوسری طرف کچھ لوگ جنھوں نے اپنے چہروں کو ڈھانپا ہوا ہے جو لکڑی کی بڑی بڑی لٹھوں سے لوگوں کو ہانکتے ہوئے اس لیبارٹری میں لا رہے ہیں۔ کیونکہ جس ملک میں انسان کی حالت

زار اور حالات کے جبر کا شکار معاشرہ جس میں حکمرانوں کی گرفت میں انسانیت سسکتی نظر آئے وہاں ایسے حالات واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن لوگوں کو تجربہ گاہ میں ہانک کر لایا جا رہا ہے ان میں مصنف کے کچھ جاننے والے لوگ بھی موجود ہیں جن میں بزرگ جو بہت سچا اور کھرا انسان ہے اسی بزرگ کے دو ساتھی دیوانہ اور خیرو ہیں جو اس مرشد کے بہت اچھے دوست ہیں، یہ سب لوگ اپنے اوپر ہونے والی ظلم و زیادتی کو دیکھ کر پریشان کن حالت میں کہتے ہیں:

''ہم وفا اور سچ کو منزل سمجھتے ہیں یہی ہمارا قصور ہے؟''[۴]

تھوڑی دیر بعد لیبارٹری میں ڈرین کی آوازیں سب کو پریشان کر دیتی ہیں مگر ڈرین کرنے والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سے تجربہ گاہ میں موجود سب لوگوں کو نقصان ہوگا۔ مگر ہوا یوں کہ یہ ڈرین کی آواز کانوں کو چھیرتی ہوئی زمین کے سینہ پر ایک گہرا شگاف کر گئی تب مصنف کے ساتھیوں میں سے ایک بول اُٹھتا ہے:

''ہرگز نہیں یہ جو ڈرین کر رہے تھے تجربہ کر رہے تھے وہ اس دھرتی کے باسی ہرگز نہیں
ان کو کیا پتہ دھرتی ماں کا پیار انسیت کیا ہے؟ اگر ان کو پتہ ہوا اور ان کا احساس زندہ ہو تو
وہ کبھی بھی ماں کے پیٹ میں ڈرین نہ کریں۔''[۵]

مصنف اپنے ساتھیوں کے باتوں میں مصروف ہی ہوتا ہے کہ لیب کے باہر بڑی گاڑیوں کی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مصنف ہمت کر کے دراوزہ کا پٹ کھولتا ہے تو اسے وسیع میدان میں کچھ لوگ گرل سے زمین کھودتے نظر آتے ہیں۔ دوسری طرف لیب میں موجود تمام قیدی آزاد ہو چکے ہوتے ہیں جو اوندھے منہ تار سے لٹکائے گئے تھے وہ سفر آخرت کرنے میں کمیاب ہو گئے باقی سب قیدی زخموں سے چور اپنی ذات میں سب کچھ بھول گئے ہیں۔ مصنف اور اس کے ساتھی سب لوگوں کو دیکھ کر باہر جانے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں مرشد جو کافی دیر سے خاموش یہ منظر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ زخموں سے چور لوگوں کو دیکھ کر کہتا ہے:

''ہم تو اتنے ناتواں اور کمزور ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہم گونگے، بہرے ہیں آنکھیں
ہیں جو صرف دیکھ سکتی ہیں صرف ایک جھلک اس کے بعد زبان تالو سے چپک جاتی ہے
اور کان ہیں کہ جب ہم پیدا ہوئے تھے تو ان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا تھا۔''[۶]

مرشد کی بات سن کر سب لوگ سسکتے کے عالم میں مرشد کو تکنے لگتے ہیں کیونکہ اس وقت دروازہ پر نئے لوگ اس تجربہ گاہ میں تجربہ کرنے کے لئے آ چکے ہوتے ہیں۔

ادب کا متن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں نہ ہی وہ وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت ہے بلکہ ادب تو ان کے آگے چلنے والی مشعل بردار حقیقت ہے منظور راہی نے اس حقیقت کا دامن پکڑتے ہوئے معاشرتی، سماجی و مذہبی حالات اور تغیرات کو ادب کا موضوع بنایا اور افسانوں کی شکل میں اس عہد کی تیزی سے بدلتی ہوئی فضا میں آنے والے حالات کو محسوس کرایا اور انہی افسانوں کے ذریعے بھوک و پیاس، سماجی پستی، جبریت و بربریت اور غلامی جیسے مسائل کی نشاندہی کرائی تا کہ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں جو ہمیں لاچاری، سستی، توہم پرستی اور مخالفت کی طرف لے جاتے ہیں عظیم لیبارٹری میں بھی کچھ ایسی ہی فضا قائم کی ہے جس میں وقت و حالات پر خوف نے دانت گاڑے ہوئے ہیں اور یہ افسانہ ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں معاشی جبر کا شکار ایک ٹوٹتے سماج اور اس کے اقدار سے بغاوت کی ابھرتی لکیروں کی تصویر کشی کی گئی ہے جس میں لوگوں کو اوندھا لٹکایا گیا ہے۔ جو چیخ چیخ کر اپنی وفاداری پر جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اس افسانے میں لیبارٹری کو معاشرے کا نام دیا گیا ہے جس میں نت نئے حکمران بدلتے رہتے ہیں اور اپنی مفاد کی خاطر عوام کو مشکلات، تنگدستی و بدحالی میں ڈال کر ان کی زندگی کے ہر رخ کو معاشی عوامل و احوال کے ساتھ متصل کر کے اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے لوگوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے جس معاشرے میں انسانی قدریں ناپید ہو چکی ہوں شہر جنگل کا روپ دھار لیں تو وہاں ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا سماج کی ناگفتہ بدحالی اور سیاسی و معاشی جبر اور معاشی پسماندگی کے ہاتھوں بنتی بگڑتی اخلاقیات اور سماجی اقدار اس معاشرے کا شکار بن کر رہ جاتا ہے معاشرے میں جو انسان سچا اور کھرا ہو اسی کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے آج کل ملک میں نفسانفسی اس قدر پھیل چکی ہے کہ جو لوگ حق پر ڈٹ جاتے ہیں وہی قصوروار ٹھہراتے ہیں ہر حکمران اپنے مفاد اور ضرورتوں کے لیے بھاگے چلے جا رہا ہے ہر چیز جبر کے ہاتھوں مجبور ہے ایک نہ تھمنے والا چل چلاؤ ہے حکمرانوں میں لالچ اس قدر بڑھ گیا ہے عوام پر ظلم و تشدد کرنے کے اور ہر قسم کا تجربہ کرنے کے بعد بھی پیٹ کی آگ نہیں بجھتی نہ کسی اور طرف دھیان جاتا ہے سب اپنی دُنیا میں مگن ہیں ہمارے معاشرے میں ناانصافی، نااہلی، جبر و بربریت اتنی عام ہو چکی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی بجائے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں ان کو دوسروں کی تکلیف نظر نہیں آتی ایسی ناانصافی کی وجہ سے باہر سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ معاشرے کو ناتواں اور کمزور سمجھ کر ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان پر مختلف تجربے کیے

جاتے ہیں جس قوم میں ناانصافی عام ہو اُس قوم کی مثال گونگے یا بہرے انسان کی سی ہے جس کی آنکھیں تو ہیں جو صرف دیکھ سکتی ہیں زبان ہے کہ تالو سے چپک گئی ہے کان ہیں کہ سننے سے قاصر ہیں سب ایک دوسرے سے اس قدر انجان ہیں جیسے کچھ سنائی بھی نہ دیتا ہو جسے ان کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا ہو ہر ملک کا باشندہ اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے پیار کرتا ہے باہر سے آنے والے لوگ ملک اور عوام کو نقصان ہی پہنچائیں گے آج کل ہمارے معاشرے میں ایسے ہی لوگوں کو پناہ دی جاتی ہے وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارتے ہیں اور ہمارے مسلمانوں پر تجربہ کرتے ہیں کبھی تیروں کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور کبھی کوؤں کی طرح لوگوں کو نوچتے ہیں مگر ہمارے مسلمانوں کو نفرت افراتفری نے اس قدر گھیرے میں رکھا ہوا کہ یہ لوگ آپس میں مل جل کر رہنے کی بجائے ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں سب ایک دوسرے کو نیچا دِکھانے کے لیے خود کے کتنے رویے بدلتے ہیں اپنے نفس اور سوچ کو پرکھتے ہیں بس اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور یہ لوگ ایک دوسرے کو دھوکے میں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہر باہر سے آنے والے لوگ روز اپنے مفاد کی خاطر حکمرانوں کے ساتھ مل کر معاشرے کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اپنے تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں منظور راہی نے اس افسانے کے ذریعے ڈھیلے ڈھالے سانچوں اور مخصوص منظروں کے برعکس سامنے موجود معاشرے کے متنوع رنگوں کو قریب سے دیکھنے اور مصور کرنے کے رجحان کو فروغ دیا ہے اور زندگی کی اصل وارداتوں اور اصل منظروں پر توجہ مرکوز کروائی ہے اس افسانے کے ذریعے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ جس قوم میں نااتفاقی نفرت اور خلاف ورزی جنم لے چکی ہو لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں حکمرانوں میں انسانیت ختم ہو چکی ہو انسانیت نام کی کوئی چیز نہ ہو دلوں میں سوائے لالچ اور مفاد کے کچھ نہ ہو احساس مندی، رواداری ختم ہو جائے تو کوئی بھی دشمن اس ملک و قوم پر قبضہ کر سکتا ہے جس معاشرے میں انسان کی ناآسودگی، محرومیوں، تکلیفوں اور کربناکیوں کا سبب سماجی ناانصافی اور معاشی ناہمواری کو قرار دیا گیا ہو وہاں سماجی و معاشی انقلاب کے ذریعے انسان کے انفرادی دکھوں، اجتماعی مسئلوں کو حل کرنے کی بجائے ان کو نظر انداز کیا جائے تو ایسے ملک میں رکاوٹیں، فسادات، ظلم و تشدد بڑھتا ہے اور بے سکونی جنم لیتی ہے انسانی ظاہر و باطن، امیری غریبی، حاکم و محکوم اور فرد و سماج کا تضاد بار بار ابھرتا ہے اور معاشرہ بربریت کا شکار رہتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ گلزار چوہان، ''میدان ادب کا شہسوار اور بانجھ موسموں کے سفر کا راہی منظور راہی''، (مشمولہ)، ''امروز''، لاہور: روزنامہ، ۱۹۹۰ء

۲۔ ذکاء الرحمٰن، ''دیباچہ''، (مشمولہ)، بانجھ موسموں کا سفر از منظور راہی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۲

۳۔ ذکاء الرحمٰن، ''دیباچہ''، (مشمولہ)، بانجھ موسموں کا سفر از منظور راہی، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۲

۴۔ منظور راہی، ''عظیم لیبارٹری'' بانجھ موسموں کا سفر، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۴۰

۵۔ منظور راہی، ''عظیم لیبارٹری'' بانجھ موسموں کا سفر، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۴۳

۶۔ منظور راہی، ''عظیم لیبارٹری'' بانجھ موسموں کا سفر، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۴۲

☆☆☆

عمران اذفر

جھمکا جان

(پہلی قسط)

سفید رنگت جیسی پنجاب کے میدانی علاقوں میں عموماً ہوتی ہے، موٹی موٹی مگر الجھاوے سے بھری آنکھیں، جو کبھی کاجل کی فراوانی کے باعث اپنی اندر موجود وحشت کو چھپاتی تھیں تو کبھی خالی اور کھوکھلی زندگی کی چغلی کھاتی تھیں۔ پتلے اور چھوٹے ترشے ہوئے بال، گردن کندھوں کے ساتھ جڑی ہوئی اور کشش سے خالی، جس پر وقت کے بہاو کے ساتھ گوشت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا، گھٹے ہوے کندھے، جن پر چڑھا گوشت خون کی سرخی سے عاری اور خالی پن کے احساس سے بھرپور، بتیس برس کی عمر میں وہ چالیس کے پیٹے میں محسوس ہوتی تھی مگر اسے اپنے اور وقت کے درمیان موجود اس صورت حال کا احساس نہ تھا۔ جھمکا جان مزاجاً ہجرہ نشین ہے وہ ایک تنگ، بوسیدہ اور اندھیرے سے بھرے کمرے کی مکین ہے، ایک ایسا کمرہ جو زندگی کے ہر تلخ و شیریں تجربے کے اختتام پر اس کا واحد سہارا بنتا ہے، وہ طاقت کی دیوانگی کی حد تک پیاسی ہے، اس کی پیاس عام انسانوں سے الگ طرح کی ہے، ایسی پیاس جو صدیوں کی محرومی کا حاصل ہو سکتی ہے یا جنم جنم کے بھٹکنے کے بعد انسانی نفسیات کا لازمہ بن سکتی ہے ایسا لازمہ جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہی پیدا نہ کی جا سکتی ہو۔ مگر وہ اپنی اس خواہش کے اظہار سے خوف کھاتی ہے کہ کہیں اس کے اردگرد کے لوگ جھمکا جان کی اس فطری کمزوری کو بھانپ نہ لیں، ایسی کمزوری جس کے سامنے وہ بے بس ہے اور جس کا شعور رکھنے کے باوجود بھی وہ اس پر قابو نہیں پا سکی یا شاید وہ اس پر قابو پانا ہی نہ چاہتی ہو کہ اس نفسیاتی ضرورت کے ساتھ جڑی لذت اس کے لیے ایک نشے کی کیفیت اختیار کر چکی تھی۔ مگر اس کے وجود سے جڑے اس سچ کو وہی جانتا ہے جو اس کی معیت میں کچھ وقت گزارے یا اس کی مجلس میں رہنے کا تجربہ کرے۔ جھمکا جان کے ساتھ وقت گزارنا اپنی سطح پر ایک الگ اور انتہائی مختلف تجربہ ہے، وہ ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی نہ ایک سا سوچتی ہے نہ ایک سے

نظریات پہ کاربند رہتی ہے۔ اس کے مزاج کی یہی سیلانیت اور بے تکا پن اس کو اپنے صنفی قبیلے اور ہم عمروں سے الگ کر دیتا ہے وہ اپنے جیسی دکھنے والی عورتوں اور لڑکیوں سے الگ تھی کافی الگ باوجود اس کے کہ وہ انہیں کے جیسی ناک رکھتی تھی ان کی طرح اس کے کندھوں کے گرد برا لپٹا ہوتا اور دوسری بہت سی عورتوں کی طرح اس کے کمر سے نیچے گوشت کی موٹی دبیز تہہ تھی مگر اس سب کے باوجود وہ ان سب سے الگ تھی، بہت زیادہ الگ اور بہت زیادہ دور، یہاں تک کہ بطور عورت اسے پہچاننے کے لیے ایک اور طرح کا کشٹ اٹھانا پڑتا ہے کہ یہ ظاہری خدوخال اس کے اندر کے بہت سے رنگوں کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ اپنے آس پاس موجود لوگوں سے برعکس وہ نئی عادتیں اپنانے کی کوشش کرتی ہے نئے نئے لوگوں سے رسم وراہ بناتی ہے تاکہ نئے نئے تجربات سے لطف اٹھا سکے، مگر کامیاب نہیں ہوتی۔ نئے رشتوں کو مکمل آزادی اور فراغ دلی کے ساتھ قبول کرتی ہے، ہر طرح کی اجنبیت کی دیوار کو گرانے میں پہلے قدم آگے بڑھاتی ہے، بہت دور تک اس نئے رشتے کا ساتھ نبھانے کا عزم کرتی ہے۔ ساحل کی ریت پر ننگے بدن لیٹتی ہے۔ ٹھنڈے، نرم، چھوٹے چھوٹے پاؤں سے اپنے ساتھی کے تلوؤں کو قربت بھرے احساس سے سہلاتی ہے اپنے وجود کی بے انت بے چینی کو اپنے جیسے کسی وجود میں منتقل کرنا چاہتی ہے۔ چلمن کی اوٹ سے نئے ساتھی کی سرگوشیاں سنتی ہے رنگ برنگ چلمن کو اپنے جسم کے گرد تان کر ایک احساس کو خود پر طاری کرتی ہے، اپنے ساتھی کو اپنے تنہا دکھی دل کا حال سناتی ہے اس کے ماضی اور حال کو گہرائی تک کرید کرید کر اس کے اور اپنے حالات کے درمیان موجود مشترک اتفاقات پر بار بار ہنستی ہے، اور چلمن کو اوڑھے اپنی زندگی کے حسین اور بدصورت اتفاقات اسے بتاتی چلی جاتی ہے، اپنے نئے دوست کے سامنے وہ مسلسل بولتی جاتی ہے اور اپنے اندر کے سب رنگ ساتھ لیٹے ساتھی کے جسم پر انڈیلنا چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ بسرے لمحوں کو فسانہ بنا کر اپنے رفیق کا دل لبھاتی کہ زندگی ایک خوش گوار واہمے کا روپ دھار لے، مگر جلد ہی اس سب سے تھک جاتی ہے، اوب جاتی ہے اور سب کچھ چلمن کے سرسراتے رنگ برنگ پردوں کے پیچھے چھوڑ چھاڑ پھر سے اپنے میلے دھول سے اٹے حجرے کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ اور پھر کئی ایک دن ہجرے کی تنہائی اور ملگجی روشنی میں غصے اور کرب سے بھری نظمیں کہتی ہے کڑواہٹ اور ترشی سے بھری ایسی نظمیں جو عورت کی بے وقعتی اور معاشرے میں اس کی جنسی ضرورت کا اعلانیہ ہوتی ہیں۔ جن کے متن سے مردانہ معاشرے پر طنز کیا جاتا ہے۔ یک رخا طنز جو تصویر کے ایک پہلو کا نمائندہ ہوتا یعنی اس پہلو کا جس

سے جھمکا جان زندگی اور رشتوں کو دیکھ رہی ہوتی تھی اسی عمومی اور عامیانہ رویے کے ساتھ جیسا ہر بہت عام فرد کا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہجرے میں نفسیاتی الجھاوے میں گندھی کہانیاں لکھتی ایسی کہانیاں جو اپنے قاری میں غصہ بھر دیں۔ یوں لگتا اس سارے عمل سے وہ اسی جنسی لذت کو کشید کر رہی ہے جس کی تلاش میں وہ تھوہر کے رس کو اپنے لب پہ مل لیتی تھی۔ وہی لذت جس کو پانے کے لئے جھمکا جان ہجرے کی کھردری چارپائی اور دیواروں سے پلستر اترے فرش کی کلفت سے بھاگ کر مخمل کے فرش پر سرسراتے پردوں کی اوٹ میں زاویے بدلتی تصویر میں اپنا آپ تلاش کرتی تھی۔ وہی صورت جس میں وہ کافی شرمناک لگتی مگر خوب زاویہ بھی کہ جسمانی خم اور لچک بہر کیف شوق دید کو مہمیز کرتی۔ اس اقت اس کا ناقابل فراموش دقی سوگوار چہرہ، جو شہر کے سماجی حلقوں کی بددیانتی اور مکروہ منافقانہ رویے سے شاقی تھا، اچانک سے کھل اٹھتا اور اس کے گول گول سفید گالوں پر معصومیت رقص کرنے لگتی اور چھوٹے قد میں گندھا نرم پیٹ دلچسپ حد تک لچکدار ہو جاتا اور اس کی خالی خالی آنکھیں شراب کی سی تیزی اور گہری ترشی سے بھر جاتی تھیں۔ یوں جھمکا جان فرصت کے لمحوں میں ایک نئے جہان کی سوار ہوتی اور اس کا معمولی اور بظاہر غیر متناسب جسم ایک خاص گولائی اختیار کر لیتا۔ ایسی گولائی جو خندق میں چھپا سپاہی فضائی حملے سے بچاو کے لئے اپنی تمام تر توانائی خرچ کر کے اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے جسم پر ایک خاص انداز کی خوف سے بھری ارتعاشی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جوں وہ اپنے آپ کو اس جان لیوا حملے سے محفوظ رکھنا چاہتی ہو۔ ایسا غیر متوقع حملہ جو اس کے جسم کے ہر حصے کو ادھیڑ کر رکھ سکتا ہے۔ ایسا ہی ارتعاش جھمکا جان کے لچک دار بدن کو گھیرے ہوتا، ایسا حملہ جو اس کے خون کی گردش پر اپنی واردات سے پہلے ہی اثر انداز ہو چکا ہوتا جیسے وہ اس کے سواگت کو پہلے سے تیار ہو چکی ہو وہی عمل جو اپنی تمام تر خوفناکی کے باوجود اس کا پسندیدہ فعل تھا۔ اس کی پھولی ہوئی شریانوں میں دوڑتا ہوا لہو تیز رفتاری کے باعث اس کی الجھی سانسوں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ جھمکا جان کی گردن پر ابھری ہری لکیریں اس خون کے فشار سے اس قدر پھول چکی تھیں کہ جیسے وہ ابھی پھٹ جائیں گی۔ اس پکے ہوئے آم کی سبز جلد کی طرح جو اپنے جثّے میں بھرے رس کی شدت سے ہار کر اپنے بدن کے بخیے ادھیڑ دیتا ہے۔ جھمکا جان اس لذت کوشی کی اس درجہ اسیر تھی کہ وہ اس سارے کے بعد کتنا سارا وقت ٹوٹے پھوٹے جسم کے ساتھ گزارتی، اس کے تھکے ہارے شکست خوردہ جسم میں اس قدر توانائی نہ ہوتی کہ وہ فومی دبیز بستر پر سیدھی ہو کر لیٹ سکے۔ بعض وقفے وہ تکیوں کے سہارے گزارتی اور پھر سے

رفتہ رفتہ نئی سرشاری اس کے جسم میں بھر جاتی، جیسے وہ سدا کی سکھی اور تازہ دم ہو۔ مگر یہ خوشی اور فرحت کا احساس جھمکا جان کے لئے وقتی ہوتا اور وہ تیزی کے ساتھ اس حالت میں لوٹ جاتی جو اس کی زندگی کے دن سے عبارت تھی۔ یہ اس زندگی سے قطعی برعکس تھی جو وہ شوق کے لمحوں میں گزارتی تھی گویا اس کی زندگی کے دو رخ تھے ایک حقیقی اور دوسرا علامتی، زندگی کا حقیقی پہلو خود اسے اپنی پلیٹ میں لے لیتا اور مرضی کی ڈگر پر چلاتا، وہی راستہ جہاں چلتے ہوئے اسے سخت کوفت کا سامنا کرنا پڑتا اور اسے اپنے اردگرد سے شدید گھن آتی، مگر وہ ایک بے حس جانور کی طرح وہ سب کرتی جاتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے وہ سب کرنا ہے۔ مگر اپنی علامتی زندگی اور اس سے جڑے دن اور راتیں وہ خود تلاش کرتی پھرتی جوں شہد کی مکھی رس بھری کلیاں تلاشتی رہتی ہے اور اس کھوج میں طرح طرح کے کشٹ اٹھاتی ہے، یہی وہ زمان ہے جب اس کی گول چھاتیاں اور بھرے ہوئے کندھے سڈول ہو کر تن جاتے۔

میں جھمکا جان کا بہت کم وقت کا ساتھی رہا ہوں، یوں سمجھیں ان خاص وقفوں میں جب وہ کسی نہ کسی مقام پر قیقم پذیر ہوتی اور خود کو تلاش کرتی یا فتح کی سرشاری سے لب ریز ہوتی یا شکست کی ندامت سے چور چور ہوتی، تو اس طرح کے کسی وقفے میں میرا وجود اس کی قیام کا مرکز بنا۔ یہ اقرار کرتے ہوئے میں کسی سطح کی ارفع احساسی کیفیت کو محسوس نہیں کر رہا مگر اتنا سچ ہے کہ اس کا بھوکا سیلانی وجود مجھے ایک الگ قسم کی لذت سے آشنا کرتا تھا (جس قدر کہ لذت کے احساس سے میں عمر کے اس حصے پر واقف تھا) اور میں بہت آہستہ روی سے، کچھ احتیاط اور کچھ دوری کے التزام کے ساتھ اس وقتی لذت کو اپنے تخیل کے اندر اتارتا، باوجود اس کے کہ میں بطور فرد اس کے لئے عافیت خانہ تھا۔ ایک خفیہ مکان جس کی دیواروں کی حفاظت میں وہ اپنے کپڑے اتار سکتی تھی۔ اس نسبتاً منظّم اور خوبصورت کمرے میں ننگے بدن کے ساتھ چہل قدمی کر سکتی تھی، آزادی سے بھرپور لمبی لمبی سانسیں لے سکتی تھی، کمرے کی دیواروں پر آویزاں آرٹ کے اعلیٰ نمونے اور کتابوں سے بھری الماریوں کے روبرو کھڑے ہو کر ایک نوعیت کی ذہنی آسودگی حاصل کر سکتی تھی۔ حالانکہ وہ ایسے کچھ افعال کسی اور کمرے میں بھی انجام دے سکتی تھی کی عام انسانوں کی مانند مختلف کمرے بھی تھوڑی بہت تبدیلیوں اور خوبیوں خامیوں کے ساتھ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نیم ملگجے تنگ حجرے میں بھی اپنی ننگی بھوکی چھاتیوں کو دیکھ سکتی تھی کہ اسے خود کو اس حالت میں دیکھنا پسند تھا۔ اسی حجرے میں جو اس کی اذیت ناک تنہائی کا ساتھی تھا۔ مگر اس حجرے میں پھیلی سیلن کی بو، اس کی

دیواروں پر چپکے بڑی شخصیات کے پوسٹر، جو دیوار کی بدصورتی کو چھپانے کے لئے جگہ جگہ چپکائے گئے تھے۔ دیواروں سے اکھڑتا ہوا پلستر اور سیمنٹ کے فرش پر پھیلی ریت، جو فرش میں پڑی درزوں سے نکل نکل کر پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ سب اس کے حجرے کو بے ترتیب اجاڑ اور اس کے لئے وحشت انگیز بنانے کو کافی تھا۔ مگر یہاں وہ سکون اور آرام کیلذت سے بہرہ ور ہوتی، جہاں وہ اپنی مرضی کے زاویے پر سوسکتی، جہاں وہ اپنا بچہ پیدا کرسکتی تھی۔ ایسا بچہ جو ورنہ پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے گا، یا اسے کسی جوہڑ میں بہادیا جائے گا، کہ ہیہ اس کا مستقبل ہے کہ پیدائش کے بعد وہ اذیت ناک موت کو روزانہ کی بنیاد پر قطرہ قطرہ گوارا کرے، جھمکا جان جانتی ہے کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک انجکشن چند گولیوں اور کچھ سائنسی عمل سے بہت آسان موت کا انتخاب کرلے مگر وہ اس کے لئے ہمت جمع نہ کرسکی کہ ماں بننا اور تکمیل کے اس زینے سے گزرنا اس کے سکون کے لئے لازم تھا۔ اسی طرح کے سوالوں میں الجھی جھمکا جان بار بار میری جانب دیکھتی اور کھلی بانہوں اور سسکیوں سے میرے اندر جذبات کو موجزن کرنا چاہتی، کہ میں بھی اس سے بے پناہ محبت کا اظہار کروں، اس کی سی بے باکی کے ساتھ اس کے وجود کو سراہوں اور دور تک اس کا ساتھ نبھانے کے وعدے کروں، مگر وہ شاید نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں ہوسکتا، کسی کو چھونا یا ایسے کسی عمل سے گزرنا گو ایک سطح پر انسانی خواہش کا نتیجہ ہی ہوتا ہے مگر یہ سب من کی مرضی کی محتاجی ہے۔ مگر شاید جھمکا جان اس عمل کے حوالے سے اس حد تک خود کے سامنے بے بس ہے کہ وہ دوسرے کے احساس کو سمجھنے میں اپنا وقت تباہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔

میں یہ جانتا ہوں کہ جسم کے ملاپ کا یہ عمل انسانی دماغ سے جڑا ہوا ہے جس کو ہم محض خواہش ہا اشتہا کی دیوار میں قید کر کے اپنی ذاتی کوشش اور منصوبہ بندی کو چھپانی کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ انسان اپنی دماغ کی صلاحیت سے دوسرے انسان کو مغلوب کرتا ہے۔ اس سب کو جاننے کے باوجود میں جھمکا جان کو یقین دلانے کی کوشش کرتا کہ میں ہر قسم کے حالات میں اس کے ساتھ ہوں اور یہ ساتھ اس کے دوسرے سماجی رشتوں کی طرح سطحی ضرورت کی تکمیل کے لئے نہیں ہے۔ جب وہ اپنی کسی نئے تجربے سے ناکام اور بدمزہ ہو کر لوٹتی تو میں اس کی ڈھارس بندھاتا اور یقین دلاتا کہ وہ درست موقف رکھتی ہے جبکہ اصل میں مجھے اس کے عمل سے گھن محسوس ہوتی، مگر میں اس کی مدد کر کے دوبارہ اسے زندگی کے قریب کرنے کی تگ و دو کرتا۔ ایسے

وقت میں اپنی الجھی گنجلک لکیروں سے بھرا ہاتھ اس کے ابھرے ہوئے پستان پر رکھتا اور یوں وہ مکمل سکون کے ساتھ اپنے پسندیدہ کمرے میں اپنے نرم چمکتے جسم کے ساتھ چہل قدمی شروع کر دیتی۔ اس کے چہرے پر اطمہنان کھیلنے لگتا اور میں اپنی پسندیدہ کتاب کی اوٹ میں چلا جاتا۔

زندگی کس قدر کریہہ اور عجب رنگ ہے کئی رنگوں میں پیوست اا ور الجھی ہوئی، ہو بہو جھمکا جان کی طرح، اور اس بے اعتبار زندگی کے رشتے کس حد تک اتفاقی اور غیر فطری ہوتے ہیں اس کا یقین مجھے جھمکا جان کے ساتھ تعلق نبھاتے ہوئے بہت شدت سے ہوتا، جھمکا جان سے اس قربت یا دوری کا میرا رشتہ محض اتفاقی نوعیت پر تعمیر ہوا، میں جھمکا جان کے سراپے کا مداح نہ تھا اور نہ ہی میں نے اس کی طرف شوق سے قدم بڑھائے تھے بلکہ وہ میرے گرد آن لپٹی اور لپٹتی ہی چلی گئی اور یہ سب مجھے کسی سطح پر مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ یہ چاہے جانے کا احساس تھا جس کی لذت کو محسوس کر کے میں کچھ الگ سا سوچنے لگتا تھا۔ جب وہ اپنی بے پایاں اور لازوال محبت کا یقین دلاتے ہوئے روتی چلی جاتی تو اس کے آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے اس کی موٹی موٹی گردن سے کچھ نیچے جا کر غائب ہو جاتے تو اس کے سیاہ بال (جن میں سے اب بعض سفید ہو چکے تھے) باہم الجھ کر بدنما ہو رہے ہوتے اور وہ مجھ ایسے مفلوک الحال انسان کے ساتھ محبت کا اعلان کر رہی ہوتی تھی، اس انسان سے محبت کا اعلان جو اسے پرتعیش زندگی نہیں دے سکتا تھا مگر جس کے پرسکون کمرے کے در و دیوار کے مابین وہ خود کو محفوظ تصور کرتی تھی، عین اسی لمحے میں دکھی ہو جاتا تھا، اس لئے نہیں کی میں جھمکا جان سے محبت کرتا تھا یا اس کے ساتھ اسی نوعیت کے کسی رشتے میں جڑا تھا بلکہ میں اس خلش کی وجہ نہیں جانتا تھا مگر یہ سچ ہے کہ اس وقت میں گہرا دکھی اور مغموم ہو سا جاتا تھا۔

میں جھمکا جان سے اس طرح کا کوئی تعلق یا نسبت نہ رکھتا تھا جس طرح کے جذبات کا اظہار وی کرتی تھی کیونکہ میں اسے دوسرے عام لوگوں کے طرح سمجھتا تھا۔ میں یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ میں لوگوں کو بہت ساری سطحوں پر ایک دوسرے سے مشابہ سمجھتا ہوں تھوڑے زیادہ فرق کے ساتھ ایک جیسے، جوں جھمکا جان اور روزی کم و بیش ایک جیسی کردار تھیں، اسی طرح پھل جھڑی اور جھمکا جان بہت ساری باتوں عادتوں اور ضرورت کے امکانات کے حوالے سے ایک جیسی تھیں جیسے کسی نی کسی سطح پر سب انسان ایک جیسے ہوتے ہیں یا ایک جیسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جیسے سب مرد کسی ایک سطح پر ایک جیسے ہوتے ہیں ایک سے اچھے، ایک سے برے، ایک سے

حیوانیت پسند، ایک سے وحشی، ایک سے مخلص، ایک سے لالچی، ایک طرح کے ایماندار اور ایک طرح کے عاشق بہت پہلے جب میں اس طرح نہیں سوچتا تھا یا میں نے اپنے تجربے سے ایسا نہیں سیکھا تھا تو میں نے ایک انسان کو بہت قریب سے محسوس کیا، اپنے آپ سے بھی زیادہ قریب سے، میں نہیں جانتا کہ میں اسے جھمکا جان کہوں یا روزی یا پھر پھل جھڑی کی شناخت سے پہچانوں یا میں اس کو چھپن چھری کا نام دے کر سمجھنے کی کوشش کروں، مگر میں ان میں سے کوئی نام نہیں دے رہا کیونکہ وہ ان سب میں کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے۔ یعنی بہت سارے دوسرے لوگوں اور کرداروں کی طرح اپنے نام یا شناخت سے محروم ایک عام کردار، مگر مجھے اس سچائی کا ادراک بہت بعد میں ہوا افسوس بہت بعد میں کہ جب کپاس کے کھیتوں سے ہریالی جھلستی دھوپ نے چھین لی تھی۔ جب نرم وملائم روئی کو کارخانے بھیج کر زمین کو ننگا اور بے لباس کر دیا گیا تھا۔ اور یوں اس کی ساری شادابی اس سے چھین لی گئی تھی۔ تب میں جان پایا کہ میں جس کا اسیر ہوں اور جس کے نغموں ایسے قہقہوں میں زندگی کی سچائی تلاش کرتا ہوں اور جس کی آنکھوں کی دنیا میں کائنات کے رموز پنہاں سمجھتا ہوں وہ ایک ہیولہ ہے، جو اپنے اردگرد پھیلے بہت سے کرداروں کا مجموعہ ہے، عین ہربرٹ اسپینر کی مانند جو بہت سے دوسرے فلسفیوں سے مل کر بنتا ہے اور یوں اس کا ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہے۔ بالکل ایسے ہی وہ ادھر ادھر سے حاصل کی گئی کئی شناختوں میں تقسیم تھی اور اپنی فطرت سے مجبور وہ کوئی شناخت پانے کے لیے یا اپنے تک کسی اطمینان کو پانے کے لیے اس نے میری شناخت کا ماسک بھی چہرے پر سلیقے سے چڑھا لیا تھا، جعلی لوگوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی جعلی پن کو اصلی ثابت کرنے کے لیے کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں تاکہ ان کی چوری پکڑی نہ جا سکے، اگر یہ لوگ یہی محنت اپنے مزاج کی دنیا میں کریں تو مجھے یقین ہے کہ اپنی ایک منفرد پہچان حاصل کر لیں۔ مگر اپنے اندر موجود چوری کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ افراد مختصر راستے کا چناو کرتے ہیں۔ مگر جب میں اسے پہچان پایا تو وہ بہت بھونڈی لگ رہی تھی، اس پہچان کے ساتھ جو اس نے ہتھیائی تھی یا جسے ہتھیانے کا بھرپور جتن اس نے کیا تھا، معاف کیجیے گا میں اسے پہچان نہیں سمجھتا اور یہی وجہ ہے کہ مرکزی شہر کی سب تشاعرات اور جعلی شناخت رکھنے والے دانشور مجھ سے بغض اور کینہ رکھتے ہیں، ان میں سے کئی نے پہلے پہل مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، کئی شاعرات نے اپنی محبت بھرے بازوں کا حصار مجھے تحفتاً عنایت کرنے کی پیش کش بھی کی۔ مگر میں اپنی شناخت کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میں خود کو کیسے کسی کے پردے میں چھپا سکتا ہوں کہ یہ منفی

سرگرمی ہے۔ میں بہت سے لوگوں کی طرح زندگی سے محض عیاشی کا تقاضا نہیں کرتا، ہمارے ہند پاکستانی سماج کی جھمکا جان اور روزی اسی طرح کے جعلی ماحول کی پیداوار ہیں، جو اپنے جسمانی اور سماجی خواہشات کی تسکین کے لیے ایک کامیاب چہرے کی تلاش میں ہوتی ہے جس کو وہ ماسک کی مانند استعمال کر سکے۔ اور پھر وہ اس کامیاب آدمی سے آنکھیں چرا کر ایسا کمرا تلاش کرتی ہے جہاں وہ زمانے اور اسی فرد سے چھپ کر، پورے سماج کے معاشرتی نظام سے چھپ کر اپنی من مرضی کا وقت کاٹ سکے۔ ہمارے ملک کے سیاسی، سماجی اور مذہبی رویوں میں عدم توازن کی وجہ سے اس طرز کی دھوکا دہی عام ہو کر معاشرتی زوال کو مزید گہرا کر رہی ہے اور یہ صورتحال روز بہ روز مزید گھمبیر صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

جب میں یہ سب نہیں جانتا تھا تو میں نے اسے بہت قریب سے محسوس کیا، اپنی پتلیون کے اندر ذخیرہ پانی کے کشکول سے بھی کہیں نیچے اور محفوظ پناہ گاہوں میں، کہ اس کہ موجودگی کے ساتھ ہی پانی کے یہ چشمے پھوٹنے لگتے اور ہر طرف جل تھل ہونے لگتا تھا۔ لیکن وہ میری غلطی تھی ایسی غلطی جس کا کوئی سدھار نہیں، جیسے کوئی نرم وملائم موتیے کی بیلوں کی کیاری میں خالص تیزآب کا ڈرم انڈیل دے، تو اس عمل سے موتیے کی گداز نرم خو بیل کے ساتھ کیا ہوگا؟ شاید ایسا ہی نقصان میں نے اٹھایا یا اس سے کچھ زیادہ کہ میں ابھی زندہ ہوں اور زندہ رہنا بذات خود ایک تجربہ ہے اس امکان سے الگ کہ یہ تجربہ بہت خوشگوار ہو یا بے حد تکلیف دہ۔ خیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایسے وقت میں جھمکا جان زاروقطار روتی اور اپنے ہونے کی بے توقیری پر غمزدہ ہوتی تو میں بھی افسردہ ہو جاتا مگر میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ اس کے لیے محفوظ کمرے کی صورت اختیار کروں جہاں وہ مکمل آزادی محسوس کرے، پرسکون نیند لے سکے، آزادانہ چہل قدمی کر سکے اور اپنا من چاہا بچہ جن سکے، جسے وہ سماج کے سامنے لانے کی جرات نہیں کر سکتی تھی، اس مہربان شخص کے سامنے بھی نہیں جس کا ماسک اپنے چہرے پر چڑھا کر اس نے اپنی شناخت گھڑی تھی۔ وہی بچہ جو اس کی آزادی کا حاصل ہے ہر ذمہ داری اور مذہبی یا سماجی پابندی سے فرار کا حاصل، جو سماج کے سامنے آیا تو تمام عمر جوہڑ میں لت پت زندگی گزارنے پر مجبور ہوگا۔

☆☆☆

لیاقت علی

فصیلِ ذات

بیگم درانی آج بھی اپنے روایتی قصّوں، نت نئے انکشافات اور مشاہدات کا پنڈورا باکس لیے دفتر میں آئیں تو مجھ سمیت نیوز بینچ پر بیٹھے سبھی ساتھی سب ایڈیٹرز کے قدرے تھکے ہوئے اعصاب میں اچانک جیسے کسی نے توانائی سی بھر دی۔ چپڑاسی نے معمول کی خفّت سے بچنے کے لیے ازخود پوچھا:

''چائے کا پانی گرم کر دوں؟''

انہوں نے اپنی ٹیبل کے دراز میں چابی گھمائی اور ٹی بیگز اور خشک دودھ کی مطلوبہ مقدار کا یقین کرتے ہوئے بھنوؤں کو قدرے سکیڑا اور پھر انہیں ڈھیلا چھوڑتے ہوئے مسکرائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں اس مستطیل میز کے گرداگرد ہم چار لوگ بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے بیگم درانی کے نہ ختم ہونے والے قصّے سُن رہے تھے۔ گزشتہ چھے ماہ میں کہ جب سے وہ اس اخبار سے وابستہ ہوئی تھیں، ہم نے ان سے اتنے قصّے سنے تھے کہ اگر ہم محض خبریں ایڈٹ کرنے والے سب ایڈیٹر ہی نہیں فسانہ طراز بھی ہوتے تو نجانے کتنی شاندار کہانیوں کے خالق بن چکے ہوتے۔ لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ بیگم درانی کے منہ سے اس تواتر سے دنیا جہان کے یہ واقعات سننے کے باوجود ہم میں سے شاید ہی کوئی ہو جو انہیں ٹھیک سے جان سکا ہو۔ اپنی باتوں میں نہ آنے والے ٹھہراؤ اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بیان کے باوجود ان کی اکثر باتیں ہمارے لیے ہمیشہ پہیلیاں ہی رہیں۔ خود ان کی اپنی ذات سے متعلق ہم یہی جان پائے تھے کہ ورکرز کالونی کے جس مکان میں وہ رہتی ہیں وہ ان کے محبت کرنے والے شوہر نے بنوا کر ان کے نام کر دیا ہے اور ان کے احتجاج کے باوجود بیرونی دروازے پر انہی کے نام کی تختی لگوائی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیگم درانی کو زندگی کی ہر آسائش دینے کے نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجائے وہ اٹلی ہجرت کر گئے ہیں۔ اب وہ ایک ملازم لڑکے کے ہمراہ اسی گھر میں سکون سے رہتی ہیں۔ اُدھر مسٹر درانی اگر ایک دن بھی ان کی آواز نہ

سنیں تو اٹلی کی گنجان آباد سڑکیں انہیں ویران جنگلوں ایسی لگنے لگتی ہیں۔ ہر چھے ماہ میں وہ ایک مہینے کی رخصت پر گھر آتے ہیں تو اس ایک ماہ میں وہ اور بیگم درانی کیا کیا کرتے ہیں؟ بلکہ یوں کہیے کہ کیا کیا نہیں کرتے، اس کی اتنی تفصیلات ہیں کہ شاید میں بیان نہ کر سکوں۔

میرے کولیگز تو کیا خبر اِن کی باتوں میں کوئی فطری ربط تلاش کر لیتے ہوں مگر میری وہمی طبیعت ان کی زندگی سے جڑے ان بے شمار قصّوں میں کئی ایسے تضادات تلاش کر لیتی ہے جن کا جواب میں چاہنے کے باوجود ان سے نہیں پوچھ پاتا۔ یوں انکشافِ ذات کے سو مرحلوں سے گزر کر بھی وہ میرے لیے ایک پُراسرار کردار ہی رہی ہیں۔

لیکن محض، ایک گذشتہ کل کے دن نے میرے لیے بیگم درانی کی شخصیت میں موجود پُراسراریت کو واقفیت میں بدل دیا ہے۔ آج جب میں نیوز ڈیسک پر بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا ہوں اور بیگم درانی گاہے بگاہے ایڈٹ کی جانے والی خبروں کی سرخیوں پر مشوروں کے ساتھ ساتھ اپنے روایتی قصّوں کو بھی بیان کر رہی ہیں تو میری آنکھوں میں شناسائی کی چمک اور ہونٹوں پر ایک ایسی پُراطمینان مسکراہٹ ہے جو شاید اب ان قصّوں کی زیادہ مؤثر تفہیم کے سبب پھیل گئی ہے۔

ہوا یوں کہ پرسوں میں جب صبح کی شفٹ ختم ہونے پر نیوز ڈیسک پر پہنچا تو ابھی بیگم درانی اور دیگر کولیگز نہیں آئے تھے۔ عین اُسی وقت ایک متوازن قد و قامت کی قبول صورت خاتون دفتر میں داخل ہوئی اور پوچھنے لگی:

''معاف کیجیے گا میری آپ سے شناسائی تو نہیں مگر کیا آپ میری راہنمائی کر سکیں گے؟''

میں اس قدر پُرتکلف مگر شُستہ زبان میں پوچھے اس سوال پر پہلے تو قدرے چونکا پھر جواب دیا:

''جی جی کیوں نہیں، اِس میں زحمت کیسی!!''

''مجھے دراصل بیگم درانی سے ملنا ہے۔ غالباً وہ اسی دفتر میں بیٹھتی ہیں؟''

''جی جی یہیں ہوتی ہیں مگر ابھی نہیں آئیں۔'' خاتون کے استفسار پر میں نے کہا۔

''ابھی تشریف نہیں لائیں!''

انہوں نے نجانے میرے جملے کو تہذیب سکھانے کی خاطر کہا یا خود سے بولیں! پھر کچھ توقف کے بعد پوچھنے لگیں:

''بالعموم کب تک تشریف لے آتی ہیں؟''

''جی بس آنے ہی والی ہوں گی۔'' میں نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تشریف لانے ہی والی ہوں گی۔۔۔۔''

انہوں نے جیسے مجھے پھر سے خبردار کیا یا شاید خود سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ پھر سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:

''اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

''جی جی! آپ بیٹھیے۔ میرا مطلب ہے تشریف رکھیے کیوں نہیں کیوں نہیں!''

میں نے کرسی ان کے قریب کرتے ہوئے کہا تو وہ شکریہ کہتے احتیاط سے چادر کا پلو درست کرتے بیٹھیں اور پھر بولیں:

''دیکھیے آپ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے نا کہ نہیں مت بیٹھیے! اور ایسے میں مجبوراً مجھے باہر دھوپ میں بیگم درانی کا انتظار کرنا پڑتا کیوں کہ ملنا تو خیر میں نے ان سے ہر حال میں تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

اب میں اس غیر متوقع اور بے تکّے سے سوال کا کیا جواب دیتا۔ بس رسمی انداز میں یہی کہا:

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں!''

مگر وہ تو جیسے میری بات اچکنے کے لیے تیار تھیں۔ فوراً ٹنک کر بولیں:

''ایسی ہی بات کیوں نہیں..... محترم..... معاف کیجیے گا آپ کا نام؟''

''امجد۔۔۔۔ امجد کھوسہ۔۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''جی ہاں تو کھوسہ صاحب ایسی بات کیوں نہیں۔ کیا آپ ہمارے سماج کے مردوں کو نہیں جانتے؟ آپ تو خود ایک باخبر ادارے کے ملازم ہیں اور میں توقع رکھ سکتی ہوں کہ آپ کہیں بہتر سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہوں گے۔ پھر آپ کے پاس تو بے شمار معلومات بھی ہوں گی کہ ہمارے یہاں عورت کا استحصال کس کس طرح ہو رہا ہے۔''

اب میں انہیں کیا کہتا کہ بی بی میں نے تو یونہی بنا کسی ارادے کے ایک جواب دیا تھا۔ آپ نے تو بات ہی اُچک لی۔

خیر میں نے موضوع کو بدلنے کی غرض سے پوچھا:

''اچھا آپ چائے پسند کریں گی؟''

''چائے۔۔۔۔۔۔!!''

انہوں نے تصدیق چاہی یا شاید وہ مخاطب کے سوال کو ایک بار خود سے پوچھنے کی عادی تھیں۔

''جی چائے۔'' میں نے پھر سے دہرایا۔

''لیکن ایک شرط پر!'' وہ بولیں۔

''شرط پر.....! وہ کیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''چائے کا بل میں ادا کروں گی۔'' انہوں نے پرس کی زِپ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہے آپ ہماری۔۔۔۔!''

اس سے پہلے کہ میں اپنی بات مکمل کرتا وہ سنجیدگی سے میری بات کاٹ کر بولیں:

''اگر نہیں تو براہِ مہربانی زحمت مت کیجیے۔''

میں نے اب کوئی جواب دیئے بغیر چپڑاسی سے کہا:

''دو چائے لے آؤ۔''

''آپ بیگم درانی کی کوئی عزیز ہیں؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''عزیز۔۔۔۔۔!'' انہوں نے شاید پھر خود سے دریافت کیا اور بولیں:

''میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتی کہ وہ میری کیا ہیں۔ کیوں کہ اس سے اگلا سوال یقیناً آپ یہ پوچھیں گے کہ آپ کو ان سے کیا کام ہے؟ اور میں جس کام سے آئی ہوں وہ قطعی طور پر آپ کو بتانا پسند نہیں کروں گی۔''

''جی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔۔۔۔۔ معذرت!!!''

میں اپنے اس سرد لہجے کے بعد یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے معذرت چاہیں گی مگر وہ آہستہ سے بولیں:

''اچھی بات ہے کیوں کہ آپ پوچھ بھی لیتے تو میں آپ کو نہ بتاتی۔''

''ویسے بیگم درانی کب تک آ جاتی ہیں آفس؟'' انہوں نے پھر سے اپنا پہلا سوال دہرایا۔

''وہ باہر آئی ہوئی ہیں بس دفتر میں آتی ہی ہوں گی۔'' میری بجائے چپڑاسی نے چائے کی پیالیاں ٹیبل پر سجاتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھہرو چائے کے پیسے لیتے جاؤ۔''

اس بار انہوں نے چپڑاسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور پھر بیس بیس کے نئے آنے والے دو نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ کچھ ہی دیر میں بیگم درانی بھی آ گئیں تو وہ اٹھیں اور لپک کر انہیں گلے لگاتے ہوئے بولیں:

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے بیگم درانی، آج تم نے دفتر سے رخصت نہیں لی۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنے آئی تھی۔''

''مگر رفعت میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ پہلے ہی آج قدرے دیر ہوگئی ہے اور بہت سا کام ابھی باقی ہے۔ شام سے پہلے میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی۔''

بیگم درانی یہ کہتی ہوئی اپنے کام میں مصروف ہوگئیں اور میں غیر یقینی کے اس مختصر سے لمحے میں اس خاتون کو دیکھنے لگا جس کا نام ابھی ابھی مجھے بیگم درانی کی زبانی معلوم ہوا تھا۔ وہ بیگم درانی کو دیکھتے ہوئے بولیں:

''کیا تم اپنا ایک دن کا کام میرے لیے چھوڑ نہیں سکتی؟''

''ایک منٹ کا بھی نہیں۔۔۔۔۔''

بیگم درانی نے اسے بِنا دیکھے قطعیت سے کہا۔ پھر شاید خود ہی اپنے اس رویے اور درشت لہجے کو بھانپتے ہوئے بولیں:

''دیکھو رفعت دفتر میں یہ سب باتیں نہیں ہوسکتیں۔ تم ایسا کرو میرے گھر جاؤ وہاں ملازم لڑکا ہوگا تم وہاں آرام کرو میں فارغ ہوکر آؤں گی تو تم سے بات کروں گی۔''

''مگر میرے پاس تمہارے نئے گھر کا پتہ۔۔۔۔۔!''

''تم آؤ میرے ساتھ!''

بیگم درانی نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور پھر تیزی سے اپنی نشست سے اٹھیں اور اسے کلائی سے پکڑے یوں دفتر سے نکلیں گویا باہر دھکا دینے والی ہوں۔ وہ بھی عجب تذبذب میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بیگم درانی کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئیں۔

''کیا وہ اسے غصے سے باہر لے گئی تھیں؟''

''ممکن ہے اُن کو نیوز ڈیسک پر یہ بحث ہم سب کے کام میں بے جا مداخلت محسوس ہوئی ہو۔''

''ممکن ہے اسے خود گھر تک چھوڑنے گئی ہوں۔۔۔۔۔''

''وہ اگر بیگم درانی کی دوست تھیں تو ان کے گھر سے واقف کیوں نہ تھیں؟''

''اور پھر یہ نیا گھر۔۔۔۔۔؟؟''

میرا تجسّس ابھی ایسے کئی سوالات کے جواب تلاش کر رہا تھا کہ وہ اُسی تیزی سے واپس آئیں اور نیوز ڈیسک پر رکھا اپنا نظر کا چشمہ اٹھا کر پھر سے آنکھوں پر ٹکایا اور نہایت سنجیدگی سے

سامنے رکھی خبروں کی ایڈیٹنگ میں مصروف ہوگئیں۔

''بیگم درانی خیریت تھی؟؟؟'' مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے سوال کیا۔

''جی میں اسے ٹیکسی میں بٹھانے گئی تھی تاکہ وہ گھر چلی جائے۔''

''مگر یہ خاتون تھی کون؟''

''آپ سے کیوں ملنے آئی؟''

''آپ سے کیا رشتہ تھا؟''

''اگر دوست تھی تو آپ کے ایڈریس سے واقف کیوں نہ تھی؟''

''یہاں کا پتہ اسے کس نے دیا؟''

ایسے بہت سے سوالات تھے جنہیں میرے اندر کے صحافی نے فوراً اُچھال دیا مگر میں ان میں سے کوئی ایک بھی بیگم درانی سے نہ پوچھ سکا۔ شاید ان کے تاثرات اور قدرے مصنوعی بے نیازی مجھ سے خود ہی کہہ رہے تھے کہ امجد کھوسہ پلیز کوئی سوال مت کیجیے گا۔

اگلے روز بیگم درانی حسبِ روایت نیوز ڈیسک پر آئیں تو چپڑاسی معمول کے مطابق چائے کا پانی گرم کرلایا۔ انہوں نے چائے کا کپ تیار کیا اور دھیرے سے گھونٹ بھرتے ہوئے بولیں:

''بے چاری نے بڑے دکھ جھیلے ہیں۔''

''کون بے چاری؟'' میں سمجھا شاید بیگم درانی کوئی خبر پڑھ رہی ہیں۔ میں نے ان کے جملے کے جواب میں محض معلومات لینے کے لیے پوچھا۔

''کون۔۔۔۔۔!!!''

بیگم درانی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے دہرایا اور پھر بولیں:

''وہی رفعت اور کون جو کل آفس میں آئی تھی۔''

میں گذشتہ شب کے بکھیڑوں میں کل آنے والی اُس خاتون کو اب فراموش کر چکا تھا۔ ان کے یاد دلانے پر اب پوچھا:

''ہاں ہاں! کیا بنا پھر وہ آپ کے گھر پہنچیں؟''

''ہاں رات میرے ساتھ ہی تھی۔ ابھی اسے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے کے بعد سیدھی یہیں آرہی ہوں۔''

''کون تھی وہ۔۔۔۔ اور خیریت تھی۔۔۔۔ کیا دکھ تھا اسے؟''

میں نے اب اپنا قلم رکھ دیا اور کرسی پر بدن ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

''میری کلاس فیلو تھی۔''

بیگم درانی نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بات شروع کی۔

''بہت کھلنڈری، نہایت ذہین اور متاثر کن شخصیت کی مالک۔ کھوسہ صاحب آپ نے اسے کل دیکھا تھا نا؟''

''کیا مطلب بیگم درانی! ظاہر ہے دیکھا تھا۔''

بیگم درانی کے اِس عجیب سوال پر میں نے بھنویں سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ میرا مطلب ہے رفعت دیکھنے میں اب ویسی نہیں رہی۔ وقت بہت بے رحم ہے کھوسہ صاحب۔ کیسی کیسی صورتوں اور سیرتوں کو کھا جاتا ہے۔ یہی رفعت تھی کہ چلتی تھی تو گویا وقت بھی ساتھ چلتا تھا اور رکتی تھی تو وقت کی نبضیں بھی تھمی ہوئی محسوس ہونے لگتی تھیں۔''

انہوں نے اپنی کلاس فیلو کے تعارف میں جو شاعرانہ زبان استعمال کی، اس نے میرے تجسّس کو مزید بڑھا دیا اور میں اب یہ قصّہ نہایت دلچسپی سے سننے لگا۔

''کالج کے ہر پروگرام کی جان تھی۔۔۔۔۔''

وہ بول رہی تھیں۔

''کیا ٹیبلو، کیا مذاکرے اور کیا کھیل ہر جگہ گویا پہلے انعام پر رفعت کا نام لکھا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے ہم سب لڑکیاں ہی نہیں ہماری بہت سی استانیاں بھی رفعت سے جلتی تھیں۔ اس دور میں کہ جب دھوپ کے خوبصورت چشمے صرف فلمی ہیرو ہی پہنتے تھے، رفعت نت نئے چشمے لگا کر آتی تو ہم رشک بھری نظروں سے اُسے دیکھتے رہ جاتے اور اس وقت کہ جب ہمارے بالوں کی چٹیا نہ صرف کسّی رہتی بلکہ ہماری مائیں اس میں خوشبودار تیل ڈالنا بھی نہ بھولتیں؛ رفعت شیمپو سے دھلے کھلے بال لہراتی کالج کی راہ داریوں سے گزرتی تو یوں محسوس ہوتا ابھی اڑنے لگے گی۔ کھوسہ صاحب! آج تو ہر ایرا غیرا نت نئی خوشبوئیں لگائے باہر نکلتا ہے نا مگر ہم نے اس وقت بھی رفعت کے پرس میں پرفیومز کی خوبصورت بوتلیں دیکھیں۔۔۔۔ پھر بی۔اے کرتے ہی گھر والوں کو نجانے کیا سوجھی کہ اس کی شادی کر دی۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی سو باپ کی ساری جمع پونجی بھی اسی کے حصے میں آئی۔ شوہر پہلے پہل تو ہر مرد کی طرح بہت اچھا ثابت ہوا مگر پھر دھیرے دھیرے تیور بدلنے لگے اور ایک وقت وہ آیا جب کالونی کے مکینوں کے پاس رفعت اور اس کے شوہر کے جھگڑوں سے زیادہ دلچسپ موضوع شاید

کوئی اور نہ رہا۔ کئی بار لوگوں نے بِنا چادر ننگے پاؤں اسے گھر سے تیزی سے نکلتے اور بھاگتے ہوئے پڑوسیوں کے گھر جاتے دیکھا اور کئی مرتبہ اُسے پڑنے والی وہ اونچی اونچی ننگی گالیاں بھی سنیں جو اس کا شوہر دانستہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر دیتا اور اڑوس پڑوس کے رہنے والے دل ہی دل میں ایسے بد بخت آدمی کو کوستے اپنے گھروں ہی نہیں کانوں پر بھی جیسے قفل ڈالے سو جاتے۔ آئے دن کی یہ لڑائیاں اب کالونی سے عدالتوں تک جا پہنچیں اور بالآخر وہ ہمیشہ کے لیے اس گھر سے نکال دی گئی۔''

''اور اس کے ماں باپ کہاں گئے؟''

میں نے حسبِ روایت بیگم درانی کے سنائے ہوئے قصّوں میں موجود اس جھول کو محسوس کرتے ہوئے اس بار پوچھ ہی لیا:

''ماں باپ!''

انہوں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس کھینچی اور پھر بولیں:

''لوگ کہتے ہیں دونوں میاں بیوی کو کینسر ایسے موذی مرض نے ملک عدم رخصت کر دیا۔۔۔ مگر کھوسہ صاحب! کیا کینسر یونہی ہو جایا کرتے ہیں؟ بنا سبب کے؟''

بیگم درانی کی آنکھوں میں یہ کہتے کہتے رکے ہوئے آنسو چمکنے لگے۔ میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا کہ ابھی کل ہی تو وہ اس خاتون کی بات سننے پر بھی آمادہ نہ تھیں اور آج اس کا دُکھ ان کی آنکھوں سے چھلک رہا ہے۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ وہ بھی ایک توقف کے بعد بولیں:

''رفعت نے چھوٹی بڑی نجانے کتنی ملازمتیں کیں، دَر دَر کی ٹھوکریں کھائیں مگر اپنی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ اور تو اور اُس بد بخت کا نام بھی اپنے نام سے الگ نہ کر سکی کہ مبادا مراجعت کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''تو شادی کیوں نہیں کر لی پھر سے؟''

اس بار میں نے پوچھا تو وہ ایک دم جھلاّ کر بولیں:

''کس سے شادی کرتی۔۔۔ پھر ایک مرد سے۔۔۔؟ اُسی مرد سے جو عورت کو استعمال کی ایسی چیز سمجھتا ہے جو ایکسپائر ہونے پر کوڑے کے ڈبے میں پھینک دی جاتی ہے؟''

''لیکن میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں ہو سکتا۔ اب دنیا کا ہر مرد ایک جیسا تو نہیں ہوتا نا۔۔''

میں نے ان چھے ماہ میں شاید پہلی بار بیگم درانی کی کسی بات سے برملا اختلاف کیا تھا۔ اسی لیے وہ کچھ دیر تو مجھے حیرت سے دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے بولیں:

''آپ خود ایک مرد ہیں نا ۔۔۔اسی لیے۔۔۔۔۔۔خیر چھوڑیئے اب سنیے کیا ہوا ۔۔۔۔۔آپ بھی خوش ہو جائیں گے۔''

انہوں نے اپنے اعصاب کو معتدل کرتے ہوئے کہا تو میں نے اس قصّے کے کسی دلچسپ انجام کی توقع میں پوچھا:

''کیسے۔۔۔۔۔کیا ہوا اب؟''

''وہ مجھ سے مشورہ لینے آئی تھی۔''

انہوں نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

''کہتی تھی، بیگم درانی! میں ایک اعتراف بھی کرنے آئی ہوں اور مشورہ بھی چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا تم مجھ سے کوئی بھی بات کہہ سکتی ہو۔ کہنے لگی کہ میں مرد سے اپنی ساری نفرت اور اس کی طرف سے ملنے والی ساری اذیت کے باوجود اس کی کمی کو محسوس کرتی ہوں۔ میں پھر سے جینا چاہتی ہوں۔ اب جب کہ میرے حلقۂ احباب کے لوگ میرے تجربے اور خیالات کو سامنے رکھ کر کسی اور مرد کا ذکر بھی مجھ سے نہیں کرنا چاہتے، میں چاہتی ہوں، وہ مجھ سے کہیں رفعت تم اپنی نفرت کو جھٹک دو۔ تمہیں واقعی ایک مرد کی اشد ضرورت ہے۔ تم پھر سے اعتبار تو کرو مگر ایسا کوئی نہیں کہتا۔ سب اب مجھے میرے انہی معمولات سمیت قبول کر چکے ہیں مگر سچ کہوں میں اس زندگی سے اب بے زار ہو چکی ہوں۔۔۔۔۔شاید میں پھر سے بِنا چادر ننگے پاؤں ایک مرد کے تشدّد کا شکار ہو کر بھاگ کر ہمسائے کے گھر پناہ لینا چاہتی ہوں۔۔۔بیگم درانی بہت عجیب بات ہے مگر ہے تو آپ سے کیوں چھپاؤں۔ مجھے ایک مرد چاہیے۔۔!

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثر سمیت اس قصّے کو سنتا رہا اور پھر پوچھا:

''پھر آپ نے کیا مشورہ دیا اسے؟''

وہ بولیں:

''میں نے کہا ہے رفعت اب کسی مشورے یا تھپکی کی پروا مت کرو۔ آگے بڑھو اور اپنی زندگی پھر سے جیو۔ تمہاری جانب اگر کسی نے ہاتھ نہیں بھی بڑھایا تو کیا ہوا، تم خود بھی تو کسی کی طرف ہاتھ بڑھا سکتی ہو۔''

''ویری گڈ۔''میں نے خوش ہو کر کہا اور پھر پوچھا:

''پھر کیا کہا اُس نے؟''

انہوں نے ایک مضمحل سا ٹھنڈا سانس لیا اور بولیں:

''مجھے افسوس ہے کھوسہ صاحب کہ وہ ایک عورت ہے!''

''مطلب۔۔۔۔۔۔؟؟؟''

میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بغیر کوئی جواب دیے انہی بوجھل قدموں کے ساتھ آج شفٹ آف ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی جیسے منوں وزنی قدم گھسیٹتے دفتر سے باہر نکل گئیں۔

میں ابھی اس سارے قصّے پر مختلف حوالوں سے غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک وہی رفعت آج پھر تیز تیز قدم اٹھاتی دفتر میں آئیں اور بیگم درانی کی خالی نشست کو دیکھتے ہوئے بولیں:

''بیگم درانی چلی گئیں کیا؟''

''آپ۔۔۔۔۔؟''

میں نے چونک کر پوچھا تو انہوں نے از سرِ نو اپنا سوال دہرایا:

''بیگم درانی چلی گئیں کیا؟''

''جی۔۔۔۔جی شاید! آپ کو ملی نہیں کیا۔ ابھی ابھی تو اٹھ کر باہر گئی ہیں۔''

میں نے اپنی خشک ہوتی زبان کو تالو سے گیلا کرتے ہوئے جواب دیا۔

''جی کوئی بات نہیں۔۔۔۔وہ شاید چلی گئی ہوں گی۔ آپ میرا ایک پیغام انہیں دے سکیں گے؟''رفعت نے پوچھا۔

''جی۔۔۔۔جی، ضرور۔''

میرے دل میں اب رفعت کے لیے ہمدردی کے عجیب جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ اس لیے میں نے نہایت احترام اور خلوص سے کہا۔

''بس انہیں کہیے گا میں واپس نارووال جا رہی ہوں۔ کل آپ کے گھر نہ آ سکی اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔''

یہ کہتی ہوئیں وہ دفتر سے باہر نکل گئیں اور میں چاہتے ہوئے بھی انہیں روک کر کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ آج جب میں اِس یقین کے ساتھ چائے کے یہ گھونٹ بھر رہا ہوں کہ بیگم درانی اب میرے لیے کوئی پُراسرار کردار نہیں رہیں تو ایک سوال بار بار میرے ذہن پر دستک دے رہا ہے۔

''آخر رفعت کون تھی؟''

''کیا میں اس سوال کا جواب کبھی بیگم درانی سے پوچھ پاؤں گا۔۔۔''

☆☆☆

محمد عباس

پھٹا ہوا نوٹ

میں اچھرا بس سٹاپ پر اتر کے کھڑا ہو گیا۔

اس نے کہا تھا کہ میں سٹاپ پہ اتر کے کہیں اور نہ جاؤں، وہ مجھے خود ہی ڈھونڈ لے گا۔ اس لیے میں اسے میسج کر کے ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اردگرد کی رونق دیکھ کر احساس ہو رہا تھا کہ بڑا شہر کیا ہوتا ہے۔ ہمارے لاہور سے آئے پروفیسر جب کہا کرتے تھے کہ سرگودھا بھی کوئی شہر ہے تو ہمیں اپنے شہر کی توہین پہ غصہ آتا تھا لیکن بعد میں جب دو ایک دفعہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو یہ احساس ہو گیا کہ شہر کہتے کسے ہیں۔ ہمارا سرگودھا تو واقعی اس کے مقابلے میں ایک گاؤں ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس قدر بھیڑ، جو لاہور کے چھوٹے چھوٹے چوکوں میں ہوتی ہے، سرگودھا کے مرکز میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

وہاں کھڑے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس نے پیچھے سے آ کر کلاوہ مار لیا اور لگا پسلیاں توڑنے۔ ساتھ ہی نعرہ لگا کے بولا: ''اوئے سرگودھے کے مالٹے۔'' وہ ابھی تک بدلا نہ تھا۔ میں بھی ہنس پڑا: ''چول آدمی۔'' بمشکل میں نے جان چھڑائی: ''تمہاری ایسی حرکتوں سے میرا یقین راسخ ہو جاتا ہے کہ تم جنسی کج روی کے شکار ہو۔ لڑکیوں سے تو بات بھی نہیں کر سکتے اور لڑکوں کو کس کس کے چھما مارتے ہو، اور وہ بھی پیچھے سے۔''

وہ میری توقع کے عین مطابق کسی ڈھنگ کے لباس میں نہ تھا بلکہ توقع سے بھی زیادہ بے ڈھنگا لباس پہنے تھا۔ اوپر سینڈو بنیان اور نیچے برمودا، ہاتھ میں والٹ اور موبائل۔ کوئی لڑکی دیکھ لے تو چھی چھی کر کے آگے گزر جائے۔

''نہیں یارا، سب کو نہیں مارتا۔ بس اتنے عرصے بعد سرگودھا کا کوئی بندہ نظر آیا تھا، جی چاہا کہ ذرا قریب ہو کر خوشبو تو لوں۔'' اس نے ہوا میں لمبی سانس لے کر گویا سونگھا: ''ترش اور ٹھنڈی۔ اس گرمی میں بھی کلیجے کو ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔ پتا نہیں تم لوگوں میں یہ خوشبو کنوؤں کی وجہ سے آئی ہے یا کنوؤں کو تم لوگوں نے دی ہے۔ بہرحال جس دونوں میں ہی بڑا ہے۔ تم لوگوں میں بھی

اور کنوؤں میں بھی۔''

ابھی تک اس کی عادت نہیں بدلی تھی۔ جب بولنے پہ اتر آتا تو لگتا کہ گاڑی موٹروے پر چل رہی ہے، ایک ہی رفتار سے، کوئی جھٹکا کھائے بغیر۔ بے تکلف بھی اُسی طرح تھا۔ نہ سلام نہ دعا، بس اپنی بک بک شروع۔

''بس تمہاری یہی بے تکلفی مار جاتی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو حال چال پوچھ پوچھ کے مار دیتا۔ یا پھر ٹھنڈا یا گرم کہہ کر میری قوتِ انتخاب کا امتحان لینے لگتا۔''

''تمہیں تو پتا ہے کہ میں نے کبھی دوستوں کو خود سے دور نہیں سمجھا۔ سدا دل میں رکھتا ہوں۔ اسی لیے جب سامنے آتے ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے دل میں سجی تصویر باہر مجسم ہو گئی ہے۔ ایسے دوست سے تکلف کیسا۔ جب روز ملاقات ہوتی ہو تو پھر حال کیا پوچھنا اور رسمی انداز میں 'اور پھر کوئی نئی تازی' کہنے کا فائدہ۔ جب پتا ہے کہ تم ہو تو پھر کیا چاہیے۔ دکھ سکھ پھولنے کے لیے بہت فرصت ملے گی بڑھاپے میں جا کر۔ ابھی تو بس وقت اچھا گزارنا ہے، تاکہ بڑھاپے میں یہ کہنے جوگے تو رہیں کہ آہ گزرا وقت بہت اچھا تھا۔ ٹھنڈا گرم میں نہیں پوچھوں گا، مجھے پتا ہے کہ گرم تم بعد میں پیو گے۔ چاہے تم سے ملاقات تھوڑی رہی، مگر تم جیسے آدمی کی، جس سے میرا دل مل جائے، میں ہر رگ جان جاتا ہوں، اپنے بندے کی تو دل کی آنکھ سے اینڈوسکوپی کر لیتا ہوں۔''

اس کے بولنے کی رفتار کا ساتھ تو کان بھی نہ دے سکتے تھے۔ میں نے بھی نہیں سنا کہ آگے وہ کیا کہتا رہا، اس دوران ہم ملک شیک کی ایک دکان میں داخل ہو گئے تھے۔ جب کچھ دیر سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا، تو میں نے اس کی طرف دھیان دیا۔ ''اب اپنی بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ یہاں زندگی کیسے جا رہی ہے۔''

''آہ..... مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم ایسا ہی کوئی بے ہودہ سوال کرو گے۔ جس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تو تم جیسے ہر مشینی بندے کی عادت ہے کہ ملتے بعد میں ہیں اور حال پہلے پوچھتے ہیں تاکہ بات ختم ہو اور اپنا راستہ لیں۔ ارے بھائی آئے ہو نا، کچھ دیر بیٹھو، ادھر ادھر کی فضول باتیں کرتے ہیں، کچھ غیبتیں، کچھ بونگیاں، دل بہلا رہے گا۔ تم نے کون سا روز روز آنا ہے۔ یہ ایک دوسرے کا حال تو موبائل پہ معلوم ہو ہی جاتا ہے۔ اگر یہاں آ کر یہی کرنا تھا تو وہیں سرگودھا سے میسج کر کے پوچھ لیتے۔ میں اپنی تمام میڈیکل رپورٹس سمیت تمہیں سب حال بتا دیتا۔''

''اف میرے اللہ۔ پتا نہیں تم کیسے بندے ہو، رسومات کو مانتے ہی نہیں۔ ارے بھائی

میں نے تو بس رسماً پوچھا تھا۔''

''تو کیوں مانوں، یہ رسم ہوتی کیا ہے۔ ایسا کام جس کو کرتے وقت جذبے کی شمولیت ضروری نہیں۔ جی نہ چاہے تو بھی رسم پوری کر دی جاتی ہے۔ میں تو کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس میں میرا دل شامل نہ ہو۔ یا تو جی جان سے کوئی کام کیا جائے یا پھر بالکل کیا ہی نہ جائے۔ یہ ''رسمی'' طرح سے کام کرنا تم جیسی مشینوں کو ہی روا ہے۔''

ملک شیک کے گلاس ہمیں تھما دیے گئے تھے۔ سلطان الاثمار کے ملک شیک کا گھونٹ لیتے ہوئے میں نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ ہم مشینی لوگ ہی رسمی انداز میں کام کر سکتے ہیں۔ پیدا ہوئے تو ماں باپ کی رسمی شادی کے نتیجے میں، پڑھائی کی تو رسمی، کھیلے تو رسمی۔ یہی دیکھ لیں، روزگار چاہیے تو رسمی سی نوکری کا انٹرویو دینے لاہور آ گیا تھا۔ 1122 کی نوکری کرنے کا نہ میں نے کبھی سوچا تھا نہ ہی شاید آئندہ کبھی میرا من اس طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی میں یہاں ٹیسٹ دینے آ گیا تھا۔ اگر نوکری ہو گئی تو ساری زندگی رسمی انداز میں نوکری کرتا مر جاؤں گا۔ کبھی بھی اندر کے کسی جذبے کے تحت کام کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ موقع شاید ہم مشینوں کو ملتا ہی نہیں۔ یا شاید ہم اپنے لگے بندھے چکر میں اتنے الجھ جاتے ہیں کہ باہر نکلنے کو موت سمجھتے ہیں۔ ہمت ہی نہیں ہوتی کہ اس معمول کو توڑیں اور کوئی نیا طرزِ زندگی اپنائیں اور اس نے تو قدم قدم پر خود کو مشینوں سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی کوئی کام اپنی مرضی کے خلاف نہیں کیا۔ اور کبھی بھی کوئی کام کسی اور کے انداز میں نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انسان کو اور چاہیے بھی کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب چلیں، میری رہائش اس دکان میں نہیں ہے۔''

''ہاں، وہ تو مجھے پتا ہے کہ کسی فُٹ پاتھ پہ ہو گی۔''

''جان کر خوشی ہوئی کہ اب تم جملے بھی کسنے لگے ہو، پہلے تو صرف چولیں ہی مارتے تھے۔''

جب ہم نکل کے چلے تو اس نے ہنس کے پوچھا: ''اب میرے کمرے میں ہی چلو گے یا پہلے کہیں اور جانا ہے؟''

''نہیں، اور کہاں جاؤں گا؟ ابھی تو سب سے پہلے فریش ہو کے کپڑے بدلنے ہیں، پھر دیکھوں گا کہ لاہور میں کہاں گھوما جا سکتا ہے۔''

''تو پھر تیار ہو جاؤ لانگ مارچ کے لیے، ایک طویل سفر طے کرنا پڑے گا میرے کمرے تک جانے کے لیے۔'' وہ جس خباثت سے ہنس رہا تھا، مجھے احساس ہوا کہ وہ ابھی تک

تین سال پیچھے کھڑا ہے۔

''کیا مطلب، کیا کسی اور شہر میں جانا ہے۔'' میں بھی ہنس پڑا۔

''چلو تو سہی، تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔''

ہم ایک گلی میں مڑ گئے اور سیدھے چلنے لگے۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ویری سمپل۔ تمہاری خوشبو سے۔ سرگودھا والوں کی اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ بارش کے پانی میں دھلے مالٹے کی طرح ترش، جو اندر جا کے ٹھنڈ کر دیتی ہے۔'' اس نے گویا ہوا میں سونگھنے کی کوشش کی۔

''اب اتنے بھی زیادہ ادیب بننے کی کوشش نہ کرو، یہ گھسے ہوئے جملے پروفیشنل ادیبوں کے لیے رہنے دو۔ مجھے پتا ہے کہ تم پہلے سے ہی سٹاپ پہ کھڑے ہو گے، جب میں اترا ہو گا، تبھی تم نے مجھے دیکھ لیا ہو گا۔'' میں اس کی ان باتوں سے بہت چڑتا تھا جن سے ادبی بناؤ سنوار ظاہر ہوتا ہو۔

''ظاہر ہے جب تم نے آنا تھا تو میں کیوں نہ پہلے سے آ کے ڈیرے ڈال لیتا۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ سرگودھا کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ کیسے رہ رہے ہیں آج کل؟''

''وہ بھی بتا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کس کے بارے میں پوچھنا چاہ رہے ہو؟ پہلے تم سے ذرا اپنا حساب تو صاف کر لوں۔'' مجھے اس سے بہت سے سوال پوچھنے تھے، اس لیے خیال آیا کہ پہلا سوال جو سوچا تھا، کرنے کا اچھا موقع ہے، فوراً داغ دیا: ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم آج کل اتنے مصروف کیوں ہو، کوئی رابطہ ہے نہ تعلق رکھا ہے ہم لوگوں سے۔ نہ میسج، نہ کوئی کال۔ آخر اتنی بھی کیا مصروفیت ہو سکتی ہے کہ بندہ دوستوں کو ہی بھول جائے۔''

''تمہارے سارے گلے دور کر دوں گا، پہلے کمرے میں تو پہنچ لیں، تم فریش ہو لو، پھر تمہیں رگڑا دوں گا۔ ابھی تمہیں کچھ کہنے کا فائدہ ہی نہیں ہے۔'' وہ منہ سامنے رکھے چلتا رہا۔

''نہیں، مجھے پتا ہے کہ تم اپنی کتابوں میں ہی کھوئے رہتے ہو لیکن کتابیں انسانوں سے کبھی اہم نہیں ہوتیں۔ یہی تو تمہیں یونیورسٹی میں بتاتے رہے تھے کہ انسانوں سے اتنے دور نہ ہونا، کتابیں تمہیں جیتے جی زندگی سے دور کر دیں گی۔ اور اب یقیناً تمہارا حال یہی ہو گا۔ تم کسی بندے کو ملنے سے بہتر سمجھتے ہو گے کہ ایک کتاب ہی چاٹ لی جائے۔ ایسی زندگی، اللہ نہ کرے کہ کسی بھلے انسان کو نصیب ہو۔'' میں گھر سے ہی سوچ کر چلا تھا کہ اسے کس کس طرح سے لیکچر جھاڑنا ہے اور اب موقع مل گیا تھا تو کمرے میں پہنچنے تک کیسے ٹالتا۔

''تمہاری بات میں اس وقت بھی کبھی نہیں ٹالتا تھا لیکن میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ کتابوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ کتاب ہو اور باقی چاہے کچھ بھی نہ ہو۔'' اس نے اپنی عادت کے خلاف معذرت کا لہجہ اپنا لیا۔ لیکن پھر فوراً ہی جارح ہو کر بولا: ''میں تو چلو جیسا بھی ہوں، لیکن تم اپنی بھی تو کہو نا۔ پچھلے دو سال میں تم نے مجھے کتنی دفعہ یاد کیا؟ کتنے میسج تم نے کیے ہیں؟ بتاؤ تو؟ اگر میں نہیں کرتا تو میرے پاس اپنی کتابوں کا عذر ہے، لیکن تم جو مجھے بھول گئے ہو اس کا کیا بہانہ لگاؤ گے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم بھی کسی نہ کسی کام میں اتنے مگن ہوتے ہو کہ کسی دوست کو یاد کرنے کا تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ تو کیا میں تم سے کہوں کہ تم اپنا کام چھوڑ دو؟ میں نے تو پھر بھی اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا ہوا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ کبھی اس سے ایک قدم بھی نہیں ہٹا، لیکن تم کیا کرتے ہو، کبھی سوچا بھی ہے تم نے۔ زندگی میں کرنا کیا ہے، اس کے لیے کیا تیاری کر رہے ہو.....''

اف، اب وہ شروع ہو گیا تھا تو اس کو چپ کرانا آسان نہ تھا۔ یہی تو اس کی بری عادت تھی، جب بولنے پہ اتر آتا تو پھر بغیر سوچے سمجھے بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ یہ دیکھے بغیر بھی کہ جو وہ بول رہا ہے، اس کا کوئی تعلق اس کی گفتگو سے بنتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے بھی کانوں کو اس طرف سے ہٹا لیا اور بازار کی گنجان آوازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت ہم ایک پکی گلی سے گزر رہے تھے جو، بعد میں علم ہوا تھا کہ اچھرا بازار کے ساتھ جا منسلک ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ایک موڑ مڑا، میں نے اس کے پیچھے چلتے چلتے سامنے دیکھا، تو گلی دور تک سیدھی چلتی جا رہی تھی۔ آخری سرا تو ابھی نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں گھبرا گیا اور اس سے پوچھا ''یہ ہم نے جانا کہاں ہے؟ آج پہنچ جائیں گے ناں؟''

''ابھی آدھا راستہ طے ہوا ہے، بہت آگے جانا ہے۔ جب سامنے ایک بڑی روڈ آئے گی، وہاں سے تھوڑا آگے جائیں گے۔ پیر غازی روڈ پہ۔''

''اف میرے اللہ۔ یار اگر اتنا ہی فاصلہ تھا تو پہلے بتاتے، کوئی رکشا کر لیتے۔ میرے تو آدھے بوٹ اور پوری ٹانگیں گھس جائیں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ آدمی کو تھوڑا بہت پیدل چلنے کی عادت ہونی چاہیے۔ میں تو روزانہ تینوں وقت اسی چوک پہ آ کے کھانا کھاتا ہوں۔''

میں واقعی اتنے فاصلے کا سن کے پریشان ہو گیا تھا۔ ابھی سرگودھا سے آتے ہوئے اتنی ذہنی تھکن ہو گئی تھی کہ بس لیٹ پڑنے کو جی چاہتا تھا: ''عادت کو مارو گولی۔ تمہیں ہو گا شوق ابنِ

بطوطہ بننے کا۔ ہم تو اکیسویں صدی کے لوگ ہیں۔ گاڑیوں کا سہارا لے لیتے ہیں۔ پیدل چل کر دنیا دیکھنے کی بجائے گوگل ارتھ پہ دنیا کی سیر کر لیتے ہیں۔ مہربانی کرو اور ابھی بھی کوئی رکشہ پکڑ لو۔ نہیں تو میں کہیں تھک کے بیٹھ جاؤں گا۔''

''صبر سے کام لے میری جان۔ بس پانچ منٹ میں ہم پہنچ جائیں گے۔ ہمت کر کے چلتے رہو۔'' وہ اسی طرح چلتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے رکشہ کبھی نہیں پکڑنا۔ پیدل ہی گھسیٹے گا۔ سو مجبوراً اس کے ساتھ چلتا رہا۔

کافی دیر کے بعد ہم بڑی روڈ سے ہٹ کر ایک چھوٹی گلی میں مڑے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب ٹانگوں کے ساتھ زیادتی ختم ہونے والی ہے۔ ایک پانچ چھ منزلہ عمارت کے سامنے پہنچے تو وہ میری طرف دیکھ کے ہنس کے بولا۔ ''یہ ہے میری رہائش۔''

''کیا؟ یہ تمہاری بلڈنگ ہے؟''

''جی جی، میرا باپ مل اونر ہے نا۔'' وہ چڑ گیا: ''جاہلوں کے سردار! ایک کمرا لیا ہوا ہے۔ چلو، اب اندر آ جاؤ۔''

اندر داخل ہوئے تو بجائے سیڑھیاں اوپر چڑھنے کے وہ نیچے اترنے لگا۔

''یہ کیا؟ تم تہہ خانے میں رہتے ہو؟''

''کیوں، کیا اس میں کوئی برائی ہے؟ تہہ خانے میں رہنے کا مزا اپنا ہی ہے۔ نہ سردیوں میں سردی لگتی ہے، نہ گرمیوں میں گرمی۔''

''جی جی، اور پھر کسی بندے کی کوئی آواز بھی کانوں میں نہیں پڑتی۔ رہیے چل کے ایسی جگہ جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔''

میرے اس ٹانکے پہ وہ کچھ بولے بغیر مسکرا دیا۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد تہہ خانے کے کاریڈور میں سب سے آخری کمرے کے سامنے رک گیا۔ دروازے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''یہ ہے میرا ڈیرہ۔ کنجِ قفس۔ ویسے اردو والے بھی اتنے مشکل لفظ لکھ جاتے ہیں کہ.....''

''اردو کے خلاف تمہارا تعصب پرانی بات ہو چکی، کوئی اور بات کرو۔'' میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ اچھا خاصا کشادہ کمرا تھا، بس بے ترتیب بکھری سینکڑوں کتابوں کی وجہ سے تنگی کا احساس ہوتا تھا، ایک بستر زمین پہ لگا تھا، جس کے اوپر بھی کتابیں اور کاغذ پڑے تھے۔ پتا

نہیں یہ شخص سوتا کیسے ہے؟

''اردو کے خلاف نہیں، مصنوعی اردو کے خلاف، جو بولنے میں نہیں، صرف لکھنے میں سامنے آتی ہے۔ اگر بآوازِ بلند بولنی پڑ جائے تو آدمی کی زبان جلیبی بن جائے۔ ایسے لفظ جو ہم عام زندگی میں عمر بھر بول ہی نہیں سکتے، وہ اردو کی کتابوں میں بھرے ہوتے ہیں۔ فضول سب..... عام سے متبادل لفظ موجود ہوتے ہیں، ان کی جگہ جان بوجھ کر مشکل لفظ ڈھونڈ کر لکھیں گے۔ لغت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔ یہ دکھانے کو کہ ہمیں اردو آتی ہے۔ اردو آئے یا نہ آئے، زبان کا وہ حسن جو .....میرا خیال ہے کہ تم بور ہو رہے ہو؟''

''نہیں میں بور نہیں ہو رہا، مجھے یاد آتا جا رہا تھا کہ اس جملے کے بعد تم کیا کہو گے، زبان کا وہ حسن جو ادب کو مطلوب ہے وہ لغت کی جامد زبان نہیں، زندہ زبان ہے جو ہم تم بولتے ہیں.....''

''اُف، یار تجھے تو سب یاد ہے،'' اس کے چہرے پہ ستائش تھی: ''اس وقت خواہ مخواہ مکر کرتے تھے، بحثوں سے جان چھڑانے کے لیے؟''

''بس، لیکچر نہیں۔ یونیورسٹی میں بہت سنے ہیں تمہارے لیکچر۔ ابھی تو مجھے فریش ہو لینے دو۔ پہلے تو باتھ روم کا دروازہ دکھاؤ اور پھر سونے کی جگہ بتاؤ۔ شام تک سولوں تو پھر تمہاری مزید بک بک سننے کی ہمت پیدا ہو گی۔ ابھی تو تھکن بہت ہے، میں کہیں تنگ آ کے تمہارا خون ہی نہ کر دوں۔''

اس نے مجھے صابن اور ایک گندا سا تولیہ دیا اور میں نہا کے، انڈرویئر میں ہی بستر پر پڑ رہا۔ گرمی اتنی تھی کہ بستر پر لباس کا تکلف غیر ضروری تھا۔ بستر پر پہلے سے پڑی کتابیں اس نے اٹھا کے ویسے ہی ادھر ادھر پھینک دی تھیں۔ کسی قسم کے جذبات کے بغیر۔

☆☆☆

پتا نہیں میں کتنی دیر سویا رہا کہ اس کے جگانے سے میری آنکھ کھل گئی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''ہونا تمہارا

سر ہے۔ سونے کے لیے پورے سرگودھا میں جگہ نہیں ملی جو یہاں چلے آئے۔ اٹھو، کہیں باہر نکلتے ہیں۔''

''جانا کہاں ہے؟'' میں رات بہت کم سویا تھا، اس لیے ابھی بھی نیند کے کچھ کانٹے آنکھوں میں تھے۔

''شام ہو گئی ہے۔ کہیں چل کے کھانا کھا کے آتے ہیں۔''

''کہاں سے کھاؤ گے؟ ہے کوئی قریب اچھی جگہ؟''

''ادھر قریب تو کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ وہیں، اچھرا چوک پر جانا پڑے گا۔''

میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں: ''کوئی اور جگہ نہیں ہے کیا؟ میرا مطلب ہے ایسی جگہ جہاں ہم آج ہی پہنچ جائیں۔ قسم سے اسی راستے اگر چوک تک گئے تو ٹانگیں سلامت نہیں بچیں گی۔ ہاں اگر وہاں کوئی ایسی ورکشاپ ہے جہاں خراد پر نئی ٹانگیں.....''

''واہ بڑے نازک ہو گئے ہو، ایں..... ممی ڈیڈی؟ کوئی بات نہیں، اب کے تمہیں ایسے راستے لے چلوں گا جدھر سے فاصلہ زیادہ نہیں لگے گا۔''

''اگر شارٹ کٹ موجود تھا تو پہلے ادھر سے کیوں نہ لے کے آئے۔''

''الو ہو تم، لفظ سنتے نہیں، بس پیچھے پڑ جاتے ہو، فاصلہ کم ہے نہیں، میں نے تو کہا ہے کہ کم لگے گا۔ تھوڑا سا بھونڈی ماحول ہے۔ پورے لاہور کی ''بچیاں'' دیکھنے کو ملتی ہیں۔''

''ملتی ہوں گی لیکن میں ابھی اتنا ٹھرکی نہیں ہوا کہ محض لڑکیاں دیکھنے کے لیے اتنا فاصلہ پیدل طے کر سکوں''

''بڑی چَس آندی اے یار، آدمی کا جی چاہتا ہے کہ ساری عمر بازار کے ایک سرے سے دوسرے تک کا چکر لگاتا رہے اور یوں ہی زندگی تمام ہو جائے۔''

''سب بکواس ہے۔ ایسا بھی کیا ہے۔ صرف بھونڈی پر کون جی سکتا ہے؟''

''چلو تم ہی ٹھیک سہی۔ پر جب چلو گے اور مارکنگ کرو گے، تب پتا چلے گا۔''

''مارکنگ؟ کیا مطلب؟ کوئی پیپر شیپر چیک کرنے ہیں؟'' میں حیران ہو گیا۔ مارکنگ کا یہاں کیا تعلق تھا۔

''نہیں پیپر نہیں چیک کرنے یار۔ یہ میرا اپنا ایجاد کردہ کھیل ہے۔ ایک طرح کا پیپر ہی سمجھ لو۔ لیکن یہاں پیپر کاغذ کی شکل میں نہیں، بلکہ پوری لڑکی ایک پیپر کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ دیکھو اور اس کی مارکنگ کرو۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ بچی دیکھنی ہے، بے شک جتنی نظر بھر کے دیکھو اور پھر اسے ٹوٹل سو میں سے نمبر دینے ہیں۔ چالیس دے دو، پچاس دے دو، ساٹھ دے دو۔''

''ہوں..... یہ بھی کوئی شغل ہے۔ بچی دیکھی اور نمبر دے دیے۔ بس۔ یہ تو تارے گننے سے بھی زیادہ بور ہے۔''

''اف خدایا۔ یہ تم ہر چیز کو اتنا سادہ کیوں لیتے ہو؟ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے کہ دیکھا اور بس جو عدد ذہن میں آیا، بول دیا۔ پوری سائنس ہے یہ۔''

''ہوں۔ سائنس۔ میرا..... سائنس ہے۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا: ''کیا ہمارے پروفیسر صاحب اس سائنس کی ماہیت پر کوئی لیکچر دینا پسند کریں گے۔ میرا بھی جنرل نالج بہتر ہو جائے گا۔''

''لیکچر بھی دے دوں گا۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''مگر پہلے کھانا کھانے چلو، راستے میں سب سمجھا دوں گا۔''

میں ناچار اٹھا، دوبارہ نہا کر اسی کا ایک گندا سا ٹراؤزر اور میلی سی ٹی شرٹ اٹھا کے پہن لیے۔ میں جانتا تھا کہ صاف تو اس کے کمرے میں ملنے نہیں۔ جب ہم باہر نکلے تو وہ اسی طرف چل پڑا جدھر سے ہم آئے تھے۔

''یہ تو وہی شیطانی راستہ ہے جدھر سے ہم آئے تھے۔ اف میرے پاؤں کے چھالے.....''

''بس کر یار اب۔ تھوڑا سا آگے جا کر راستہ جدا ہو جائے گا۔ اب تو تمہیں اچھرا بازار کی سیر کرانی ہے۔ اسے لاہور کا دل کہتے ہیں۔ لاہور کا ہو یا نہ ہو، لاہور کے لڑکوں کا دل اسی میں بستا ہے۔ کس کا معشوق ہے جو یہاں نہ آتا ہوگا۔ روزانہ ہزاروں معشوقانِ پری رخ ادھر آتے ہیں.....''

وہ ہنس پڑا، جیسا کہ اکثر وہ اردو کا کوئی مشکل لفظ استعمال کر کے ہنستا تھا۔ میں چڑ گیا۔

''اپنی بک بک بند کرو۔ اور یہ بتاؤ کہ وہ مارکنگ والی سائنس کیا ہے۔''

''بڑی بے تابی ہے۔ ہوں۔'' وہ مجھے دیکھ کے ہنسا۔ ''چلو بتاتا ہوں۔ سائنس یہ ہے کہ ہر لڑکی کے لیے کل سو مارکس ہیں۔ جس طرح پیپر کے دس سوال، دس، دس نمبر کے ہوتے ہیں، اسی طرح لڑکی کی دس چیزوں کے دس دس نمبر ہیں۔ آنکھیں، ناک، ہونٹ، فگر، قد، چال، رنگ، چہرہ اور ذہانت۔ اس کے علاوہ دس نمبر اضافی گریس کے ہیں۔ وہ چیز جو کسی لڑکی میں حد سے زیادہ ہو، اس پہ ایک نمبر گریس کا دیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ضرور واضح کرنا پڑے گا کہ گریس نمبر کس چیز کا ہے۔''

''ہوں، یہ بات ہے۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کوئی خاص دلچسپ مشغلہ تو نہیں ہے بس لڑکیوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنا ہی ہوا۔ میں نے کہا کہ پتا نہیں کون سی مارکنگ کرنی ہوتی ہے۔'' میں واقعی اس کی بات سے بہت مایوس ہوا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے کہ بندہ اتنی دور تک چل کر جائے

اور اپنے آپ کو صرف اس کام میں بہلاتا جائے کہ کس لڑکی کی کیا چیز اچھی ہے۔ یہ فضول آدمی تو ہے ہی ٹھرکی۔ اوپر اوپر سے بہت انکار کرتا ہے لیکن اندر سے لڑکیوں کا بہت شوقین ہے۔ ان سے مل کے، ان کو دیکھ کے خوش ہو ہو جاتا ہے۔ زندگی میں لڑکی کی اہمیت سے انکاری مگر لڑکیوں کو تاڑ تاڑ کے خود کو مطمئن رکھنے والا ٹھرکی۔

اب ہم اچھرا بازار میں داخل ہو چکے تھے۔ واقعی خوب گہما گہمی تھی۔ شاید لاہور میں لڑکیوں کے شاپنگ کرنے کی یہی ایک جگہ تھی، اسی لیے اتنی بھیڑ تھی۔ تھوڑی ہی دیر چلنے کے بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس جگہ کو لاہور کا دل کہتے ہیں تو بجا ہی کہتے ہیں۔ کس کم بخت کا دل یہاں سے نکلنے کو چاہے گا۔ بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔ ''واہ، بازار تو یہ بہت خوب ہے۔ اگر آدمی نے اچھی زندگی گزارنی ہو تو یہاں کوئی دکان کھول لے۔ جنت میں تو صرف ۷۲ حوریں ملنی ہیں، یہاں روزانہ ۲۰۰۰ ۷ دیکھنے کو مل جائیں گی۔''

''اور یہ حوریں وہ ہیں جو انسانوں میں سے ہیں۔ جنہیں دیکھ کے انسان کے اندر شہوت بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ اُن حوروں کی کیا خبر۔ جنتی لوگ انہیں دیکھیں تو کیا پتا ان کے لیے مقدس محفل منعقد کرانے کا خیال دل میں پیدا ہونے لگے۔ تقدس تو ان کے تصور کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔'' وہ واقعی کبھی کبھی بہت فضول بولتا تھا۔ بعض اوقات تو بڑے بڑے گستاخانہ جملے بول جاتا تھا۔ میری طرف دیکھ کے بولا: ''چلو، تم نے مانا تو سہی کہ اس بازار میں زندگی بتائی جا سکتی ہے۔''

''ایں..... وہ تو صرف کہنے کی حد تک بات کی ہے۔ ذرا اپنے انداز میں تعریف کی تھی اس بازار کی۔ ورنہ ایسا بھی کیا دھرا ہے یہاں۔'' میں اس کی بات سے گڑبڑا گیا۔

''چلو، ذرا مارکنگ کر کے دیکھو، تمہیں مزا آ جائے گا۔ نہ آئے تو پیسے واپس۔''

''بور ہے سب۔ یہ بھی کوئی کام ہے کہ لڑکیوں کو دیکھتے رہو اور ان کو نمبر دیتے رہو۔ کالی قمیض والی کو پچاس دیے۔ سنہرے بالوں والی کے ستر نمبر..... ہونہہ۔''

''اتنا آسان کام نہیں ہے۔ بڑے دھیان سے یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ بس ایسے ہی بے سوچے سمجھے ہی نمبر نہیں دے دینے۔'' وہ چڑ گیا۔ ''اچھا تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں..... ہوگا یہ بور کھیل۔ مگر پہلے تم ایک ٹیسٹ تو دے دو۔ اگر تم نے کسی لڑکی کو پورے درست نمبر دے دیے تو میں آئندہ اس کھیل کا نام نہیں لوں گا۔ اچھا وہ جو لڑکی اس ریڑھی کے پاس کھڑی ہے، سرخ دوپٹے والی، اس کو جتنا غور سے دیکھ سکتے ہو، پھر حساب کر کے بتاؤ کہ تم اسے کتنے نمبر دے سکتے ہو۔''

میں نے نظر بھر کر اس لڑکی کو دیکھا۔ خاصی خوبصورت تھی۔ کچھ دیر سوچ کے جواب دے دیا: ''میں نے تو اس کو پینسٹھ دے دیے ہیں۔''

''ہاہا، مجھے پتا تھا۔ اتنا آسان کام نہیں ہے یہ۔''

''کیوں کیا ہوا؟ کچھ غلط کہہ دیا میں نے۔ یار وہ اچھی خاصی خوب صورت لڑکی ہے۔''

وہ اسی طرح ہنستا رہا۔ ''نہیں یار۔ وہ تو محض بیالیس کی حق دار تھی۔ تم سائنس والوں کی طرح نمبر نہ دو۔ لٹریچر والوں کی طرح ہاتھ کھینچ کے رکھو۔ ایک ایک نمبر کی وقعت جانچ کر۔''

''میرے خیال میں تو اتنے ہی ہیں۔ نہیں تو تم بتاؤ کہ اس میں کیا کمی تھی؟'' میں چڑ گیا۔ بہت خود پرست تھا وہ، ہمیشہ اپنی ہی بات منوانا چاہتا تھا۔

''کمی یہ تھی کہ تم نے اسے دور سے اور کھڑے ہوئے دیکھا۔ نہ اس کی ذہانت کا اندازہ ہوا، نہ چال نظر آئی۔ کل نوے میں سے بیس نمبر تو گئیا ورستر میں سے لٹریچر والے پینسٹھ کب دیتے ہیں۔ یاد ہے ایم اے میں کتنے نمبرز کی توقع رکھتے تھے اور ملتے کتنے تھے۔ تم نے صرف اس کے رنگ اور چہرے سے متاثر ہو کر اتنے نمبر دے دیے ہیں۔ اس کا قد قدرے ٹھگنا تھا، پورا پانچ فٹ۔ مطلب قد کے دس میں سے صرف چار نمبر۔ ناک کچھ کھڑ بڑی سی تھی۔ پانچ اس کے۔ ہونٹ بھرے بھرے اور صحیح پکے ہوئے تھے۔ نو ان کے دے دیے گئے۔ رنگ البتہ بہت ہی موزوں اور پرفیکٹ تھا۔ گریس سمیت گیارہ اس کے۔ چہرے کے چھ، اس میں وہ جنسی کشش نہیں تھی جو لڑکی کا چہرہ بار بار دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ فگر کے چار..... اس کی چھاتیاں نہایت چھوٹی تھیں اور بدن کچھ زیادہ ہی دبلا تھا۔ آنکھوں کے ۳ دے دیتے ہیں۔ کل ہوئے بیالیس۔ اب اس کے قریب جا کے سب اعضا آزما لو۔ مس ورلڈ منتخب کرنے والے بھی آ جائیں تو اس کرائیٹیریا میں اس سے زیادہ نہیں دے پائیں گے۔ کا کا، مارکنگ ایک دن کا کام نہیں۔ اک عمر لگتی ہے تب یہ ہنر آتا ہے۔''

''تم تو واقعی بڑے لفنگے ہو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم لڑکیوں کو اتنے غور سے دیکھتے ہی نہیں، لیکن تم تو ایک جھلک میں ایکسرے کر لیتے ہو۔'' میں نے مڑ کر بڑے غور سے پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ واقعی اس نے جو جو کہا تھا، اسی طرح تھا۔ حالانکہ کم بخت نے صرف ایک بار ہی اس طرف دھیان دیا تھا۔

''یہی تو بات ہے۔ جب ایک نظر میں ساری لڑکی آپ پر عیاں ہو جائے تو پھر اس کو دوبارہ توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' اس نے آنکھ ماری۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہیں استاد کا لقب میں نے ٹھیک ہی دیا تھا۔ تم واقعی ہو بھی۔'' میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہنستا رہا: ''لیکن لڑکیوں میں تمہارا انٹرسٹ کبھی دیکھا نہیں تھا، خاص طور پر اس کے.....''

''بس تم لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ دراصل میں سب تاڑ لیتا ہوں۔ اسی لیے دھوکا کھانے سے بچ جاتا ہوں۔'' اس نے میری بات پوری نہیں سنی تھی۔ شاید جانتا تھا کہ میں کس کا نام لینے والا ہوں۔ اس کی جھک جھک اسی طرح جاری رہی: ''جس کے پاس ذہانت اپنے گریس مارکس نہ لے۔ اس لڑکی کو میں دوبارہ دیکھتا تک نہیں۔ اور جو اتنی ذہین ہو، وہ میرے جھانسے میں آتی نہیں۔ اسی لیے لڑکیوں سے محفوظ ہوں.....''

میں نے ایک شاپ سے نکلنے والی لڑکی کو دیکھا، جو اپنی ماں کو بلا رہی تھی۔ دل کو ہلا دینے والی چیز تھی۔ ''اس کو میں نے اکیاسی دے دیے۔ اب بتاؤ یہ ہے اس قابل کہ نہیں۔''

''تو مجھے دوزخ میں بھیج کے رہے گا۔ میرا ایمان بگاڑ دو گے تم۔ اکیاسی کا مطلب سمجھتے ہو تم۔ اے پلس۔ اور اے پلس کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ دنیا میں صرف ایک بندے کے پاس ہے۔ اس کے بعد اتنے نمبر کوئی نہیں لے سکتا۔ ابھی تک تو میری اِس یونیورسٹی سے اے گریڈ بھی تین ہی لڑکیوں نے لیا ہے۔ تم اتنی آسانی سے کیسے کسی کو اکیاسی دے گئے ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں مارکنگ آئے گی بھی نہیں۔ احمق آدمی۔ تم یہ کام کر کے مجھے تکلیف مت پہنچاؤ۔''

مذاق میں بھی، مجھے یقین تھا، وہ سچی بات کہہ گیا تھا۔ اے پلس یقیناً اُسی کا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو اے پلس دے بھی نہیں سکتا تھا۔ میں کافی دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''چلو، اب میں کوشش کروں گا کہ احتیاط سے نمبر دوں۔ تم بھی اتنی جلدی غصہ نہ کرو۔ ابھی نیا نیا ہوں، یہ کام کر ہی لوں گا۔''

اب مجھے یہ کھیل پسند آنے لگا تھا۔ بڑے دھیان سے لڑکی کو دیکھتا، پھر اس کی ہر چیز کے نمبر نوٹ کر کے ٹوٹل اسے بتا دیتا لیکن ہر بار اس کی مارکنگ مجھ سے پرفیکٹ ہوتی تھی۔ ظالم ایک ہی نظر میں ایسی ایسی بات نوٹ کر لیتا تھا کہ مجھے انتہائی غور سے دیکھنے کے بعد ہی نظر آتی تھی۔ کھانا کھا کے واپس آئے تو بھی اسی مشغلے میں لگا رہا اور اتنا طویل فاصلہ تکلیف کے احساس کے بغیر ہی گزر گیا۔ واقعی فاصلہ بہت کم لگتا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور میں یہی کام کرتا رہوں۔

واپسی پر اس نے راستے سے چائے کا سامان لے لیا تھا اور کمرے میں پہنچ کر چائے بنانے

لگا۔ چائے بنانے کے دوران ہی لائٹ چلی گئی۔ اندھیرا گھپ۔ میں نے گھبرا کے کہا: ''اب کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے، ایک گھنٹے بعد آ جائے گی۔ تم آرام سے چائے پیو، میں دو سگریٹ پیوں گا اور گھنٹہ گزر جائے گا۔'' اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا۔

''نہیں، نہیں۔ میں آدمی ہوں۔ اے قبل از تاریخ دور کے وحشی جنگلی، مجھے آدمی ہی رہنے دے۔ چل کہیں باہر نکلتے ہیں۔ یہاں تو فوت ہو جاؤں گا میں۔'' گو کہ اندر گرمی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی اتنا حبس تھا کہ جی بیزار ہوتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ، لائٹ کے نہ ہونے سے اس تہہ خانے میں وحشت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ جیتے جی کسی نے قبر میں دبا کے دفن کر دیا ہے۔ شاید قبر بھی ایسی ہی تاریک اور حبس زدہ ہوگی۔

''اس کا بھی حل ہے، ہم اوپر چھت پر چلے جاتے ہیں۔''

''کون سی چھت پر؟ یہاں تو پانچ منزلیں ہیں، تم کس منزل کو چھت کہتے ہو؟''

''سب سے اوپر، پانچویں منزل کی چھت۔ یقین کرو، اس وقت وہاں بڑا پیارا ماحول ہوگا۔ گرمی تو بالکل لگ ہی نہیں سکتی۔ بڑا ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی ہے۔ چائے بن جائے تو وہاں جا بیٹھتے ہیں۔ میں نے ایک گدا وہاں بھی بچھایا ہوا ہے۔ جب لائٹ آ جائے گی تو واپس یہیں آ جائیں گے۔''

میں نے حامی بھر لی۔ ظاہر ہے کہ سڑک پر گھومنا اب مزید تھکائے گا ہی، کہیں بیٹھنے والی ہی جگہ ہونی چاہیے۔

اس نے چائے بنائی اور کمرہ لاک کر کے ہم اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ایک ہاتھ میں ٹرے اور دوسرے ہاتھ میں لائٹ والا موبائل تھامے وہ آگے آگے تھا، میں اس کے پیچھے پیچھے۔ سیڑھیاں بہت زیادہ تھیں۔ تھکان سے میں احتجاج کرنے والا تھا کہ اس نے بتا دیا کہ آخری منزل آ گئی ہے۔ ایک جالی دار دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ٹرے مجھے پکڑا کے دروازے کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی ٹرے اٹھائے، ہانپتا اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ میرے اندر آ جانے کے بعد اس نے جالی سے ہاتھ باہر نکال کے تالا دوبارہ بند کر دیا: ''یہاں صرف مجھے ہی آنے کی اجازت ہے۔ چوکی دار سے یاری بنائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس چائے پی لیتا ہے، اس کے بدلے کام بہت آتا ہے۔ باقی، مالکوں کا آرڈر ہے کہ کوئی آدمی اوپر نہ آئے۔ اکیلے آدمی کے لیے بڑی پرسکون جگہ ہے۔ میں اکثر شام کے وقت یہاں آ بیٹھتا ہوں۔''

چھت پر واقعی بڑی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ یہاں بیٹھنے کا مزا آئے گا۔ چھت کے

درمیان ایک گدا پڑا ہوا تھا۔ 'اسی پر وہ بیٹھتا لیٹتا ہوگا'۔ ہم دونوں اس پر بیٹھنے کی بجائے چھت کی دیوار کے پاس آ گئے۔ میں نے اپنا کپ ہاتھ میں لے لیا اور چسکیاں لینے لگا جب کہ اس نے اپنا کپ دیوار کے اوپر رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب چائے کا درجہ حرارت زیرو سے بھی کم ہو جائے گا، تب وہ پیے گا۔ ہر کام الٹے طریقے سے ہی کرتا تھا۔

اتنی بلندی پر شام کی ہوا خاصی گاڑھی اور فضا سوگوار سی محسوس ہو رہی تھی۔ نیچے اچھرہ کی بھری پُری بھیڑ تھی۔ رکشہ، موٹر سائیکل، سائیکل، کاریں، کسی جادوگر کے سحر میں بندھے سڑک پر بھاگتے جا رہے تھے۔ ایک ہی رفتار میں چلتے لوگ۔ کلبلاتے ہجوم کی ناقابلِ شناخت آوازیں۔ تھوڑی دور اچھرا بازار کی بتیاں روشن تھیں۔ درجنوں جنریٹرز کی آواز اچھا خاصا شور پیدا کر رہی تھی۔

''بہت شور ہے یہاں، کیا مزہ یہاں آنے کا۔''

''یہ شور نہیں، موسیقی ہے۔ ایک ایسی دھن ہے جس کی تال پہ سارا شہر ناچ رہا ہے۔ ہمیں تو تب برا لگے جب ہم بھی اس دھن کے سامنے مجبور ہوں، ہم تو ان سے بہت بالا ہو کر سکون کے ایک احساس سے بھرے ہیں۔''

''لیکن جو ناچنے کا مزہ ہے، وہ ناچ دیکھنے میں کب ہے؟''

''جو بھی ہو، میں تو اس موسیقی کے سحر میں نہیں آنا چاہتا۔ بس جب کمرے میں بیٹھے بیٹھے جی اوب جاتا ہے تو دل کو بہلانے کے لیے اسے یہ ناچ دکھانے اس چھت پہ آ جاتا ہوں کہ میاں یہ دیکھ لو۔ اگر سکون کی زندگی سے گھبراتے ہو تو پھر یہ اضطراب بھری زندگی گزارنی پڑے گی۔''

''لیکن تمہیں تو اضطراب پسند تھا۔ کبھی سکون سے بیٹھتے ہی نہ تھے، ہر وقت کام کام۔ اب پھر اس ناچ سے باہر رہنے کی خواہش کیوں؟''

''اضطراب تو زندگی کے لیے خود زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے لیکن وہ کسی مقصد کے لیے ہو تو بات ہے۔ خالی خولی ایک سینڈل لینے یا شرٹ خریدنے میں اضطراب اور پریشانی کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ بس گئے اور لے آئے۔ اس سے زیادہ ایسے معاملات کو کیا وقت دینا۔ دیکھو نا، لوگ گھر سے ایک ٹائی خریدنے نکلتے ہیں اور تین گھنٹے اس کی میچنگ دیکھتے رہتے ہیں، خواہ مخواہ کی ذہنی مشقت اور بوجھ۔ کم وقت میں بھی تو یہ کام کیا جا سکتا ہے، بلکہ میں تو خریدوں گا ہی نہیں، کون سا یہ لباس کا لازمی حصہ ہے۔''

گو کہ میں اس سے متفق نہ تھا۔ شخصیت میں خوب صورتی پیدا کرنے والی چیزوں کو

انسان وقت نہ دے گا تو کسے دے گا۔ لیکن میں چپ رہا۔ برمودا اور بنیان پہن کے لاہور کی سڑکیں گھوم آنے والے کو یہ بات آدمی سمجھائے بھی کیسے؟

''وقت تو دیا جانا چاہیے اندر کی زندگی پر۔ باطن میں روز ایک دنیا اتھل پتھل ہو جائے، تب مزا ہے۔''

''تو کیا تم ساری عمر اسی کمرے میں گزار دو گے؟ بڑے آئے مجید امجد؟'' میں نے طنز کیا۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ دو چار کتابیں کیا پڑھ لیں کہ خود کو بہت بڑا ادیب مانتا ہے، اور ادیبوں کی طرح فضول قسم کی خیالی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔

''نہیں یار زندگی مجھے کشش کرتی ہے۔ میں تو اس کی ہر سانس کو چکھ چکھ کے جینا چاہتا ہوں، سہولت سے، سکون سے۔ اور یہ جو زندگی تم دیکھ رہے ہو، بہت تیز ہے۔ یہ آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ اپنی عمر غٹا غٹ پی جائیں۔ چھک کے چڑھا جانے سے محض ضرورت پوری ہوتی ہے، مزا نہیں آتا۔ اور میں چیزوں سے ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ لطف لینے کا بھی قائل ہوں۔''

''ہاہا'' مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے چائے ختم کر کے خالی کپ دیوار پر رکھ دیا: ''تو کیا اس طرح لطف لیا جاتا ہے۔ تہہ خانے میں قید ہو کے؟ انسانوں کی زبان میں تو اسے ذلت بھری زندگی کہا جاتا ہے۔''

''تم اپنی کمینگی سے باز نہیں آؤ گے؟'' اس کے جملے کی بے بسی بتا رہی تھی کہ میرا وار کارگر رہا تھا۔ ''بات تمہاری بھی ٹھیک ہے لیکن یار کیا کروں، ان لوگوں کی طرح چہکنے، خوش رہنے کو من ہی نہیں مانتا۔''

''واہ..... پہلا آدمی دیکھا ہے جس کا خوشی سے جینے کو دل نہیں چاہتا۔ 'اور بھی غم ہیں زمانے میں.....' کے بعد تاریخی لحاظ سے یہ دوسرا جملہ ہے جو انقلاب پسندوں کا سلوگن بن سکتا ہے۔ پتا نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ۔''

''تمہارے علامہ صاحب جائیں کھوہ کھاتے۔ انہیں کیا علم تھا کہ زندگی کیا ہے۔ بے چارے غلام قوم کے قومی شاعر۔ تمام عمر آزادی اور حصولِ آزادی کے لیے درکار صفات پیدا کرنے کے لیے قوم کو پکارتے رہے۔ زندگی اور زندگی کے اصل تقاضوں سے بیگانہ رومانوی شخص۔''

اقبال پر طنز سن کے میرا دل اچھلا ضرور، لیکن اسے چھیڑنے سے باز رہا۔ اس سے ادب

پر بحث کی تو میری بولتی ہی بند ہونی ہے۔ اچھا ہے کہ ادب سے باہر ہی رہ کے جو باتیں ہو رہی ہیں، ہوتی رہیں۔ کچھ نہ کچھ تو ساتھ دیتا رہوں گا۔

''زندگی اور زندگی گزارنے کی خوشی کا اصل گیان تو آزادی میں ہی ہوتا ہے۔ تم یہ بتاؤ، کوئی آج تک تعین کر سکا ہے کہ خوشی کیا ہے اور کس طرح ہوتی ہے؟''

اس کا لہجہ فلسفیوں کی طرح ہو گیا تھا، میں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی جواب دے دے گا۔ میں خاموش نیچے گزرتی گاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنا کپ اٹھایا اور ہونٹوں تک لے گیا۔ چائے اب یقیناً لسی کی طرح ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ورنہ اس سے قبل وہ چائے کو ہاتھ ہی نہ لگاتا تھا۔ کپ اٹھا کے چائے کے اوپر جم چکی موٹی سی جھلی کو پھونک سے ہٹا کر، گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''اس سوال کا جواب آپ کے علامہ صاحب نہیں دے سکتے تھے۔ ان کا تو ایک ہی سوال تھا، آزادی، جب کہ یہ سوال آزادی ملنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔''

'وہ کیسے؟ غلامی میں خوشی کا احساس نہیں ہو سکتا؟''

''ہو تو سکتا ہے۔ لیکن غلام کی خوشی کی حد کا ایک تعین تو موجود ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی خوشی آزادی ہے۔ وہ آزاد ہو جائے تو اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہی ہے۔ آزاد بندے کی خوشی کیسے جانچی جا سکتی ہے؟ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ یہ میں چائے پی رہا ہوں، بالکل ٹھنڈی ہے۔ ساری دنیا گرما گرم چائے پیتی ہے تو آنند پاتی ہے۔ گرم نہ ملے تو پیتی ہی نہیں۔ لیکن میں ٹھنڈی ہی پیوں تو مجھے لطف آتا ہے۔ اپنی مرضی کی بات ہے۔ دنیا کچھ اَور طرح چلتی ہے، میری خواہش اَور طرح ہے۔ خوشی اور لطف حاصل کرنے کا کوئی طے شدہ معیار نہیں ہے؟ اگر غالب محبوب کے سوتے میں اس کے پاؤں دبا کے مطمئن ہے تو آتش اسے اور خود دونوں کو عریاں کر کے راحت حاصل کرتا ہے اور پھر چرکین تو محبوب سے اس طریقے سے حظ حاصل کرتا ہے کہ کراہت سے خود محبوب کو بھی قے آ جائے۔ یہ آزادیِ انتخاب کے کرشمے ہیں۔ میرا بھی خوش رہنے کو جی چاہتا ہے لیکن میرا خوش ہونے کا معیار دوسرا ہے، میں جس طرح رہ رہا ہوں، ایسے ہی خوش ہوں۔ دنیا جس طرح مصروف، دوڑ بھاگ میں مگن ہے، رہے، لیکن میں اس زندگی سے راحت نہیں پا سکتا۔ مجھے اسی زندگی میں مزا آتا ہے کہ ہر دن پڑھنے میں گزار دیا۔ جی چاہا تو کچھ لکھ لیا۔''

''ہاں ہاں، اور جب تمہیں ادب کا نوبل پرائز دیا جائے گا تو پورا ملک تم سے خوش ہو

کے جشن منائے گا کہ آج مہالیکھک شری ..... نے اپنے جیون بھر کی تپسیا سے سپھل ہو کے دیش کی پرتیبھا بڑھادی ہے..... پھر تم.....''

''بس بس، ڈائیلاگ بازی سے مجھے چڑ ہے۔ تم اگر میری زندگی کو ترس کے قابل سمجھتے ہو تو مجھے کیا فرق پڑتا ہ ۔ ارے بھائی، میں اپنی نظر میں ایک آئیڈیل زندگی گزار رہا ہوں اور اتنا خوش اور زندہ دل ہوں کہ اس لاہور میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ پھر کسی کو اس پہ افسوس کیوں ہو۔ وہ تو جب ہو کہ میں اپنی مرضی کے خلاف زندگی گزاروں۔''

''تو وہ زندگی کیا تھی، جس کے تم نے سرگودھا میں خواب دیکھے تھے۔ محبت کی شادی، سکھی جوڑا، کامیاب زندگی.....''

''تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ وہ خواب تھا اور خواب اگر ادھورے رہ جائیں تو اس پہ دکھ نہیں منانا چاہیے۔''

''جی جی میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو ذرا بھی ملال نہیں ہوا۔ آپ تو یہاں خوشی سے باورے ہوئے پھرتے ہیں..... یہ دکھ نہیں ہے تو کیا ہے، مایوسی بھری تو زندگی ہے۔ خود اتنے رونو بنے ہوئے ہو کہ یتیم مان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو جی کرتا ہے اور مجھے کہتے ہو کہ دکھ نہیں منانا چاہیے۔''

میرا لہجہ درشت ہونے سے وہ شاید سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کافی دیر چپ رہا۔

اب اس کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ سگریٹ جلا کر بولا۔ ''آ ادھر گدے پر بیٹھتے ہیں۔ میں تو کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔'' کپ وہیں چھوڑ کر ہم نیچے گدے پر آ کے بیٹھ گئے۔ میں بیٹھ گیا اور وہ لیٹنے کے انداز میں لمبا ہو گیا۔ ''دیکھ یار تُو تو سب جانتا ہے۔ میری زندگی کے سب سے خوب صورت دن تو یونیورسٹی کے دن تھے۔ روز اس کے ساتھ، ہر پل اس خواب میں مگن کہ یہ ساتھ سدا کا ہے لیکن وہ خواب بیت جانے کے بعد، اب جب کہ مجھے معلوم ہے کہ دوبارہ ایسا منظر کبھی سپنے میں بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا، تو مجھے زندگی میں اس سے زیادہ خوشی ملنے کی توقع بھی نہیں ہیاور جب اس سے زیادہ توقع نہیں ہے تو میں کسی ناممکن الحصول خوشی کی تلاش سے زیادہ اس گم شدہ خواب کی لذت سے سرمست کیوں نہ رہوں۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔ ''شیطان کو ہی یہ شرف حاصل نہیں ہے، مجھے بھی سرمست کر گیا ہے ٹوٹ کر میرا سبو۔ اب میرا قطعاً جی نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ دنیا کی اس دوڑ میں بھاگتا رہوں، جب اپنے حصے کی انتہائی خوشی میں پا بھی چکا ہوں۔ اب تو بس چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں، جو میری زندگی ہیں۔ تم مل گئے ہو، دل کو بہت خوشی ہوئی، اچھا کھانا مل جائے، تو میں

خوش، بجلی ساری رات نہ جائے تو دل مسرور ہو جاتا ہے۔ کبھی اتفاقاً چائے اچھی بن جائے تو شادمان۔ یونیورسٹی جاتے وقت گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے تو یہ بھی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی اب میرا اثاثہ ہیں۔ بڑی خوشی جو دنیا سے حاصل کر سکتا تھا، وہ کر لی۔''

''یہ وہی رویہ نہیں جو میر تقی میر پڑھاتے ہوئے سر نے بتایا تھا..... قنوطیت؟ تم ابھی سے کیسے مان بیٹھے کہ اب اس کے بعد تمہیں کوئی اس سے بڑی خوشی نہیں مل سکتی.....؟''

وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹا تھا، منہ دوسری طرف کر کے پھپھک گیا۔ ''پر پہلے وہ خواب دل سے نکلے تو نا؟ دل ہے کہ ہر وقت اسی کے لیے ٹیستا رہتا ہے، لکھنے بیٹھوں تو وہ سامنے آ موجود ہوتی ہے۔ پڑھتا ہوں تو اسی کے کہنے پہ۔ رات گزرتی ہے تو اسی کے سنگ، دن گزارتا ہوں تو اسی کے سہارے۔ ہر کام کرتے وقت وہ سامنے ہوتی ہے۔ میں کیا کروں؟ کیا اتنا کم ہے کہ آج تک کبھی اس کی یاد کے ہاتھوں تنگ آ کر رویا نہیں۔ آنکھ پہ ایسا پہرہ لگا رکھا ہے کہ ایک بھی نقب زن آنسو کبھی پلکوں میں روزن نہیں بنا سکا۔ کتنی بھی اذیت ہو، ریچھ بن کے برداشت کی ہے۔ تمہیں کیسے بتاؤں کہ کیا عذاب ہے جو مجھے ساری رات سونے نہیں دیتا۔ ڈھنگ سے کھانے نہیں دیتا۔''

''اس نے تمہارے ساتھ ایسا کچھ کیا، پھر بھی تم.....؟''

''کیا کیا اس نے؟''

''مائی گاڈ..... اتنا بڑا دھوکا تمہیں ملا اور تم کہتے ہو کہ کیا کیا اس نے؟ احمق آدمی اس نے تم سے بے وفائی کی تھی۔ پورے دو سال رولنے کے بعد انکار کر دیا تھا۔ بھول گئے وہ سب گالیاں جو وہاں ہمارے پاس بیٹھ کے اسے دیا کرتے تھے.....؟''

''سب بچپنا تھا اور ناسمجھی تھی۔ میں اپنی طرف داری کرتا تھا سوچنے میں۔ تب ٹھنڈے دل سے سوچتا نہ تھا۔ ہر بات پہ اسی کو الزام دیتا تھا، اسی کو قصوروار ٹھہراتا تھا۔ لیکن یہاں، جب فرصت ملی کھل کر سوچنے کی، جب بیٹھ کے سارے معاملے پہ غور کیا تو اسی نتیجے پہ پہنچا کہ.....''

اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے توقف کیا۔

''کیا نتیجہ؟''

''یہی کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ساری غلطی میری ہی تھی۔ یہ سارا معاملہ یک طرفہ ہی تھا۔ آگ اُدھر تو تھی ہی نہیں۔ جب اسے مجھ سے کوئی لگت ہی نہیں تھی تو پھر اس نے جو فیصلہ کیا، وہ درست ہی تھا۔''

''مگر وہ جو دو سال تمہارے ساتھ گھومتی رہی تھی، وہ کیا کسی دلی تعلق کے بغیر تھا؟ پوری کلاس یہ سمجھتی تھی.....''

''وہ ایز اے کلاس فیلو۔ کلاس جو بھی سمجھتی تھی وہ میری باتیں سن سن کر سمجھ رہی تھی۔ اسے کچھ جذب نہ تھا، میری طرف اور جب میں یہ جان گیا تو پھر سارا اضطراب ختم ہو گیا۔ نگاہ میں کوئی برا نہ رہا'' اس کا منہ میری طرف مڑ آیا۔ بہت جلدی اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''تو کیا اب اس کے نہ ملنے کا تمہیں قطعاً افسوس نہیں ہے۔''

''جب یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس کا دل میری طرف کبھی مائل ہوا ہی نہیں تھا تو اب اس بات کی اہمیت ہی ختم ہو گئی ہے کہ وہ مجھے ملی یا نہیں۔ جب اسے مجھ سے کوئی دلی تعلق تھا ہی نہیں تو پھر یہ اچھا ہوا کہ بات نہیں بنی۔ اگر اس کے ملنے کا کوئی راستہ سوجھ بھی جائے تو میں کوشش نہیں کروں گا۔''

''تو پھر کہیں اور تعلق بنا لو۔ کوئی ایسا تو ہو گا جو تمہیں چاہ سکے۔''

''لیکن میرا دل تو اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ میرے دل سے نکلتی ہی نہیں۔''

''لیکن تم نے کیسے مان لیا کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتی تھی؟'' میں نے پینترا بدلا۔

''بس ٹھنڈے دل سے غور کیا تو..... اس نے پورے دو سالوں میں کبھی مجھ سے محبت کا اظہار کیا ہی نہ تھا، میں سمجھتا تھا کہ ہم دونوں میں اتنی محبت ہے کہ شاید اظہار کی ضرورت ہی نہیں۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔ یہی بہت ہے۔ کیا ضروری ہے کہ زبان سے جتایا بھی جائے۔ لیکن بعد میں، مَیں سمجھ گیا کہ اسے کچھ تھا ہی نہیں اسی لیے وہ اظہار نہیں کرتی تھی ورنہ جس طرح میں خوشی سے بے تاب ساری دنیا کو بتاتا پھرتا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے، اس سے میں سمجھا ہوں کہ محبت ہو جانے کی خوشی اتنی ہوتی ہے کہ انسان اس کو سنبھال ہی نہیں سکتا۔ اور کچھ نہیں تو سب سے پہلے اپنے محبوب کو ضرور بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو اس میں شریک کرے۔ لوگ اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔ اِدھر اُس نے کبھی نہیں بتایا، اس لیے مجھے یقین ہے کہ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ صرف میرے ساتھ رہی، بس اور کچھ نہیں۔ پھر جس طرح اس نے الوداع کہا، اجنبی آنکھوں سے، وہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔''

''لیکن..... اسے تم سے محبت کیوں نہ تھی؟''

''اگر اس سوال کا جواب ملنے کا امکان ہوتا تو میں پہلے اس سوال کا جواب ڈھونڈتا کہ مجھے اس سے محبت کیوں ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''یہ بھی اچھا ہوا نا کہ اس نے اظہار ہی نہیں

کیا۔ ورنہ میں خواہ مخواہ تمام عمر اسے بے وفائی کا طعنہ دیتا رہتا۔ یک طرفہ محبت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی محبوب کو بے وفا نہیں سمجھ سکتا۔ خود اپنا ہی قصور مانتا ہے۔''

''چلو اچھا ہوا تمہیں بہت دیر بعد میں ہی سہی، احساس تو ہو گیا کہ اس لڑکی کو تم سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہی بات ہم سب لوگ اس وقت تاڑ چکے تھے۔ تمہیں کتنی بار کہا تھا کہ اس کو چھوڑ دو۔ وہ محض تمہارے نوٹس لینے کے لیے تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ہمیں تو آج تک تم پہ غصہ ہے کہ اس کی طرف سے انکار ہونے سے پہلے تم نے اسے ٹھوکر کیوں نہ ماردی۔ کیوں اس کے لیے سوچ سوچ کے پاگل ہوتے رہے۔''

''اس کا جواب بھی دیتا ہوں۔ پہلے تم بتاؤ میری اور تمہاری پہلی ملاقات جب ہوئی تو تم کس لیے میرے پاس آئے تھے؟ نوٹس لینے کے لیے ہی نا؟ یعنی اپنے مطلب کے لیے ہی ناں؟ تو کیا میں تمہیں دھتکار دیتا محض یہ سمجھ کر کہ تم مطلبی ہو؟ یہ ساری دنیا مطلب کی ہے۔ حتیٰ کہ خالق نے بھی ہمیں اپنے ہی کسی مطلب سے پیدا کیا ہے..... گو کہ وہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا اور ہم انسان تو سب اپنے اپنے مطلب کے لیے زندہ ہیں۔ اگر میں اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا تو اس میں میرا مفاد تھا، وہ میرے ساتھ رہتی تھی تو اپنے فائدے کے لیے۔ مطلب کی بنیاد پر بننے والے اس تعلق کے صدقے دونوں کا مطلب پورا ہوتا رہا۔ پھر میں اسے کیوں کوسوں اور پھر دوسری بات کہ خواہ اپنے کسی مطلب سے یا کسی اور وجہ سے، وہ میرے پاس بیٹھتی تو تھی، نگاہوں کے سامنے رہتی تو تھی۔ میرے لیے یہ کیا کم تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ میں تو جنت میں ہوتا تھا۔ یہ خوشی پانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ یہ تو اس کی کم عقلی تھی جو اس نے بہت کم کی توقع رکھی۔ ورنہ اگر اسے پتا چل جاتا کہ میں اس پر کیا وار سکتا ہوں تو وہ خدا ہی تو بن بیٹھتی۔''

''تم جو بھی کہتے پھرو، اس کی طرف داری کرتے رہو، دھوکا تو اس نے تمہیں دیا ہے نا؟ دو سال تم تو اسی دھوکے میں رہے تھے کہ وہ اب عمر تمہارے سنگ ہی گزارے گی۔ تم کس طرح رات رات بھر اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں خوابتے رہتے تھے۔'' مجھے اس پہ اس معاملے میں کب غصہ نہیں آیا تھا، جو آج نہ آتا۔

''اس نے دھوکا نہیں دیا تھا یار۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پھر نیا سگریٹ جلا لیا: ''دیکھو اچھے جیون ساتھی کا انتخاب ہر کسی کا حق ہے۔ اس کے پاس مجھ سے بھی اچھے آپشن ہوں گے۔ اگر اس نے برا آپشن چھوڑ دیا تو اس میں برائی کیا ہے۔ کیا ساری زندگی روتی رہتی۔''

''اچھا جیون ساتھی..... بکواس۔ کیا اس کے پاس تم سے اچھا آپشن تھا؟ اگر ہوتا تو وہ

تمہارے ساتھ وقت کیوں ضائع کرتی۔تم بس اپنے آپ کو تسلی دیتے ہو۔اور کچھ نہیں۔''

''تم جو بھی کہتے رہو۔میں کون سا مان جاؤں گا۔ پہلے میں بھی تمہارا ہم خیال تھا۔لیکن سینکڑوں راتیں جاگ کر گزاریں،تمام رات جلتے دل کو سمجھاتے ہوئے،اس معاملے پر غور کیا تو اصل بات سمجھ آئی۔فریب تو میں نے اُس وقت اپنے آپ کو دیا تھا،اب تو سچی بات مانتا ہوں۔اگر اس کے پاس فوری طور پر کوئی اچھا آپشن نہیں تھا تو پھر بھی وہ ایک ایسے آپشن پہ کلک کیوں کرتی جو اسے اچھا نہیں لگتا۔مناسب آپشن کی امید رکھنا اس کا حق تھا اور میں اسے اس حق سے کیوں محروم رکھوں۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔نیچے لائٹ کب کی آچکی تھی۔اس نے کپ اٹھائے اور نیچے چلنے کا اشارہ کیا۔میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا نیچے اتر آیا۔کمرے میں پہنچ کے اس نے کمپیوٹر آن کیا اور کچھ گانے وغیرہ لگا دیے۔میرا ابھی موسیقی کا موڈ نہیں تھا۔میں نے اسے فوراً کہا:''اسے بند کردو اور مجھ سے بات کرو،میں یہاں تم سے گپ شپ کرنے آیا ہوں۔گانے تو وہاں سرگودھا میں بھی بہت سن سکتا ہوں۔''

''کیا گپ سناؤں تمہیں۔یہاں لاہور میں تو بڑی اکہری زندگی گزار رہا ہوں۔اب وہ ذہن ہی نہیں رہا کہ دنیا کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑائے رکھتا تھا،اب تو صرف اپنے کام پہ دھیان ہوتا ہے۔''اس لہجے میں بے چارگی سی تھی۔

''تو کام کے متعلق ہی سنا دو۔یہ بتاؤ کہ آج کل کیا لکھ رہے ہو؟اور کبھی چھپواؤ گے بھی یا نہیں۔یا کافکا کی طرح مرنے کے بعد ہی تمہارا کام دنیا کے سامنے آئے گا۔''

''نہیں،ایسی کوئی بات نہیں۔جب اپنی کہانیوں سے مطمئن ہوگا تو پھر چھپوانے بھی لگوں گا۔ابھی تو بس لکھنے کے فن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔کافی ایک کہانیاں لکھیں ہیں۔لیکن ابھی چھپوانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔جب خود مجھے اطمینان ہوگیا تو پھر چھپوا بھی دوں گا۔''اس نے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا:''ابھی تو صرف یہی میری کہانیاں پڑھ رہا ہے۔''

''لیکن تمہارے بارے میں تو ہمیں پتا ہے کہ تم اچھا لکھ لیتے تھے۔تو پھر چھپواتے کیوں نہیں۔''

''تم لوگوں کو کیا پرکھ کہانی کی۔تم تو گجر مار کہ فلموں کی بھی بڑی تعریف کرتے ہو،جب مجھے خود احساس ہوگا کہ میرا لکھا کسی کے پڑھنے کے قابل ہے تو چھپوا دوں گا۔''وہ کمپیوٹر چھوڑ کر میری طرف سیدھا ہوگیا۔

''تو پھر کیا فائدہ لکھنے کا جب چھپوانا ہی نہیں ہے۔اللہ کے بندے! چھپواؤ گے تو دنیا تمہیں جانے گی نا۔''مجھے واقعی افسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنی محنت کر کے لکھتا رہتا ہے لیکن کبھی چھپوانے

کی کوشش نہیں کرتا۔کیا فائدہ لکھنے کا جب تعریف یا نقد کی صورت میں اس کا صلہ بھی نہ ملے۔

''دنیا کی کسے پرواہ ہے۔اپنے دل میں جو بات ہے،وہ کہہ لوں یہی بہت ہے۔کوئی جانے یا نہ جانے مجھے کیا فکر۔''

''کیا مجھے پڑھنے کو مل سکتی ہیں تمہاری کہانیاں؟میں دیکھوں تو سہی کہ تم آج کل کیا لکھ رہے ہو اور کیسے لکھ رہے ہو۔''

''مل سکتی ہیں،اکثر کا تو پرنٹ لیا ہوا ہے میں نے۔پڑھ لینا جب فارغ ہوئے تو۔ابھی تو کسی اور موضوع پر گپ کرتے ہیں۔یہ وقت میری کہانیوں پر ضائع کرنے کو نہیں ہے۔''اس نے ایک طرف پڑی فائلوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا:''تم یہ بتاؤ کہ کل کے انٹرویو کی تیاری کتنی ہے تمہاری؟''

''تیاری.....؟اچھا سوال ہے۔آخر تمہارے ساتھ ہی رہا ہوں۔یہ تیاری شیاری والا کام مجھے بھی نہیں آتا۔بس جاؤں گا،جو انہوں نے پوچھا بتا آؤں گا۔رکھ لیں تو ٹھیک،نہ بھی رکھیں تو بھی ٹھیک۔انٹرویو دیتے وقت اگر نوکری ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہو تو آدمی انٹرویو شروع ہونے سے پہلے ہی نوکری کھو بیٹھتا ہے۔''میں نے ہنس کر کہا۔ماحول کی سنجیدگی اور اس کے چہرے پر چھائی نحوست کی وجہ سے ضروری تھا کہ ایسی بات کی جائے جس سے اس کے چہرے کی لمبائی کچھ سکڑ سکے اور وہ پرسکون ہو کے باتیں کر سکے۔

اس کے بعد بڑی دیر تک ہم گزرے وقت کو دہراتے رہے۔میں نے اسے پرائیویٹ کالج میں اپنی لیکچرشپ کے دوران پیش آنے والے دلچسپ واقعات سنائے۔وہ بہت کم بولا،حالانکہ پنجاب یونیورسٹی میں اب اس کے چار سال گزر چکے تھے،اور پی ایچ ڈی بھی مکمل ہونے والی تھی،لیکن پھر بھی اس کے پاس یونیورسٹی کے بارے میں سنانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ یونیورسٹی لائف میں پہلے کی طرح دلچسپی نہیں لیتا اور صرف اپنے پڑھنے لکھنے پر توجہ رکھے ہوئے ہے۔سرگودھا سے نکلتے وقت اس کی آنکھوں نے ہم دوستوں کو بتا دیا تھا کہ اب وہ کبھی زندگی میں بھرپور طریقے سے شریک نہیں ہو پائے گا۔وہ بس اپنے آپ اور اپنی پڑھائی میں ہی مگن رہے گا۔اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہاں آ کر وہ ایسا ہی ہوگیا تھا۔

باتوں میں رات کا ایک بج گیا تھا۔اس کا تو مجھے پتا تھا کہ کہیں فجر کی اذان کے بعد ہی سوئے گا۔لیکن مجھے تو صبح انٹرویو دینے کے لیے جلدی اٹھنا تھا۔اس لیے اس کو شب بخیر کر کے سو گیا۔

☆☆☆

صبح جب میں جاگا تو وہ بے سدھ پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے جگانے کا مطلب اپنی شامت کو آواز دینا ہے۔ اس لیے خود ہی آرام سے تیاری کی اور باہر نکل آیا۔ البتہ نکلنے سے پہلے میں نے ڈھونڈ کر اس کی کہانیوں کی فائل اٹھالی تھی۔ اچھا خاصا پلندہ تھا۔ باہر آ کر رکشے پہ بیٹھ کے اپنا انٹرویو دینے ڈیوس روڈ پہنچ گیا۔ میرا نمبر ابھی بہت دور تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے اس کی کہانیاں پڑھنی شروع کر دیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس کی پانچ کہانیاں پڑھ گیا۔ ظالم اب تو بہت اچھا لکھنے لگا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر افسوس بھی ہوا کہ وہ ایسی کہانیوں کو چھپوا نہیں رہا تھا۔ خیر مجھے کیا، کبھی تو اس کی کہانیاں سامنے آئیں گی۔ آخر کتنی دیر آدمی صبر کر سکتا ہے۔

میرا انٹرویو اچھا ہو گیا۔ امید تھی کہ مجھے اپوائنٹ کر ہی لیں گے۔ خیر اس کے بارے میں کبھی زیادہ سوچا بھی نہیں تھا۔ میرا کام تو پرائیویٹ کالج میں چل ہی رہا تھا۔ واپسی پر میں سیدھا اس کے کمرے میں گیا۔ جاتے وقت ایک دکان سے چائے کا سامان لے لیا۔ کمرے میں پہنچ کر چائے بنائی اور اس کی باقی کہانیاں پڑھنے لگا۔ کل سترہ کہانیاں تھیں۔ اگر چھپواتا تو ایک کتاب سے زیادہ کا مواد تھا۔ لیکن..... خیر اس کی مرضی۔

سبھی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کہانی کا ایک نیا ذائقہ تھا ان میں۔ ایک نیا لہجہ۔ مجھے اس پر لاڈ آنے لگا، یہ تو اچھا خاصا افسانہ نگار تھا۔ اگر اسی طرح محنت کرتا رہا تو کبھی مجھے اس پر فخر ہو گا۔ فخر تو خیر ابھی بھی تھا۔ اس میں ہم سب دوستوں کو بہت کچھ نظر آتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ کچھ بنے گا۔ اس کی کہانیاں خاص تھیں۔ لیکن ان میں ایک حیرت انگیز بات تھی اور اس بات نے مجھے چونکا کے رکھ دیا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ میں اس کی کسی کہانی میں اس کی محبت اور اس لڑکی کے متعلق اس کے دلی تاثرات جان لوں گا لیکن تمام کہانیاں پڑھ گیا اور اس کی کسی کہانی میں بھی عورت نام کی چیز کا وجود تک نہ ملا تھا۔ اگر کہیں عورت آ بھی گئی تھی تو محبوب کی شکل میں ہرگز نہ تھی۔ بس ماں، بہن، وغیرہ کی صورت میں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ایم اے کی کلاس میں ہمارے سر نے بتایا تھا کہ یہ بھی کوئی کمپلیکس ہوتا ہے۔ آدمی جس سے پیار کرتا ہے، اس کا ذکر کرنے سے ڈرتا ہے۔ اب اسی الو کو دیکھ لیں، کہتا تھا کہ وہ اب بھی اسے اچھی لگتی ہے لیکن اِس کے اندر اُس کے ساتھ اتنا جھگڑا چل رہا تھا کہ کوئی عورت اِس کے فن میں جگہ ہی نہ پا سکی تھی۔ وہ اپنے اندر کہیں عورت کے وجود سے ہی انکاری ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ منافقت نہیں کر سکتا اور لکھنے میں تو بالکل نہیں۔ ابھی جو باتیں کی تھیں، وہ بھی اوپر اوپر سے ہی کی ہوں گی، اس کے اندر جو کچھ تھا، وہ کہانیوں کی شکل میں

نظر آ رہا تھا۔ اس کے باطن میں وہ سوتے ہی خشک ہو گئے تھے جو عورت کے ساتھ ناتا رکھتے ہیں۔

دو بجے کا وقت ہو گا جب وہ اپنے آپ ہی جاگ گیا۔

''اٹھے ہیں پہلوان صاحب۔ کیا آج دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ ہے جو اتنی جلدی جاگ گئے؟'' میں نے طنز کیا۔

اس نے موبائل پہ وقت دیکھا: ''ہاں، واقعی بہت جلدی جاگ گیا ہوں۔ شاید سوتے وقت بھی تمہارا خیال تھا، اس لیے جلدی آنکھ کھل گئی۔'' شرمندہ ہونا اس نے سیکھا ہی کب تھا: ''اچھا یہ بتاؤ، انٹرویو ہو گیا؟ کیسا ہوا؟''

''وہ سب بھی بتاتا ہوں، پہلے نہالو، پھر چائے بناؤ، پھر سب باتیں کرتے ہیں۔''

جب وہ چائے بنا چکا تو میں نے اسے انٹرویو کی تفصیل سنائی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ میری اپوائنٹمنٹ پکی ہے۔ میرے جواب واقعی بہت اچھے تھے۔

چائے پینے کے دوران میں ہی مَیں نے اسے بتا دیا کہ اب میں واپس سرگودھا کے لیے نکلوں گا۔ چار بجے تک نکل گیا تو اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس پہ وہ بدمزہ بھی ہوا لیکن ظاہر ہے مجھے باندھ کے تو رکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے بھی اس کی حجت کے جواب میں پھر کبھی زیادہ دنوں کے لیے آنے کا وعدہ کر لیا۔ چائے پی کے ہم کافی دیر گپیں ہانکتے رہے پھر آخر میں نے اسے اشارہ کیا کہ اب میں نکلوں گا۔ وہ بھی مجھے چھوڑنے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم دونوں کمرے سے اکٹھے نکلے اور اچھرا سٹاپ کی طرف چل دیے۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ اس کا آئندہ زندگی کا کیا پلان تھا، اس لیے راستے میں مَیں نے پھر رات والے موضوع پر چھیڑ دیا: ''تو آئندہ زندگی میں تمہارا کیا پلان ہے، کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں، کرنا کیا ہے۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں سوچا۔ بس پڑھوں گا اور..... اور..... اچھا..... جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''آخر کب دیکھو گے۔ میرا تو خیال ہے کہ وقت گزر جانے کے بعد ہی تم دیکھنے کی کوشش کرو گے۔ ساری زندگی باپ کے خرچ پر ہی گزارنی ہے؟ کچھ اپنا بھی کر لو۔ وہ ترقی پسندوں کے مسائل کا مرکزِ ثقل، میرا مطلب ہے پیٹ، اس کا کیا کرو گے؟ گھر والوں کو بھوکا مارو گے کیا؟''

''ابھی تو نہ کوئی گھر ہے نہ ابھی اتنی جلدی بسانے کا ارادہ ہے۔ جب دل چاہا تو نوکری بھی کر لوں گا اور گھر بھی بسا لوں گا۔ ابھی تو میرے پاس اپنی ذات کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ نوکری یا بیوی کو

کیا وقت دے سکوں گا۔'' اس نے جماہی سی لے کر کہا۔

''اچھا تو کیا ساری زندگی اس اے پلس کے خواب ہی دیکھتے رہو گے۔ کیا وہ ابھی بھی تمہارے ذہن سے نہیں نکلی؟''

''رات بتایا تو تھا۔''

''اوہ، میرا سوال ہی غلط تھا۔ پوچھنا یہ تھا کہ کیا ابھی تک تمہیں اس کے جانے کا بہت دکھ ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں گڑا دیں۔

''نہیں۔ دکھ کیوں۔ مجھے کیوں دکھ ہوگا۔ مجھے دکھ قطعاً نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو بس اک ملال ہے اور وہ تو رہے گا۔''

''میں لفظوں کی اتنی باریکیوں کو نہیں سمجھتا۔ میرے لیے تو دونوں ایک ہی ہیں۔ دکھ تمہیں ہے اور ابھی تک تم اس سے رہائی نہیں پا سکے۔ اسی لیے تمہاری کسی کہانی میں عورت نظر نہیں آتی۔ لگتا ہے کہ جس دنیا میں تم رہتے ہو، وہاں عورت بستی ہی نہیں ہے۔ آخر کیا بنتے جا رہے ہو تم۔ ایک عورت کے چھوڑ جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ آدمی سبھی عورتوں کو غلط سمجھنا شروع کر دے۔ جاہل آدمی کسی سے رشتہ بناؤ۔ کسی کے قریب ہو جاؤ۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ کافی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا: ''لگتا ہے تم اتنی آسانی سے نہیں سمجھو گے۔ تمہیں ذرا طریقے سے سمجھانا پڑے گا۔ آؤ پہلے کسی ہوٹل پہ میں ناشتا کر لوں، وہیں باتیں بھی کر لیں گے۔''

ہم اسی ہوٹل پہ چلے گئے جہاں رات کو کھایا تھا۔ کھانے کا آرڈر دے کر وہ میری طرف متوجہ ہوا: ''تم کہتے ہو کہ مجھے اس کو بھول کر کسی اور کے ساتھ رشتہ بنا لینا چاہیے۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھتے کہ دنیا میں ایک ہی شخص ہے جو میری ذات کو مکمل کر سکتا ہے۔ اگر وہ نہیں تو پھر کوئی بھی آ جائے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نہ ہرا ہوں گا، نہ میں پھلوں گا۔ صرف وہی ہے جو مجھے ہرا کر سکتی ہے۔'' اس نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ ''تمہیں سمجھانے کے لیے اس کی قربانی دی جا سکتی ہے۔ یہ ایک نوٹ ہے۔ اسے میں نے درمیان سے پھاڑ دیا۔ یہ آدھا میں نے اپنے پاس رکھ لیا، باقی آدھا تم اپنے پاس رکھ لو۔ اب سوچ کہ کیا یہ نوٹ اس وقت تک مکمل ہو سکتا ہے جب تک اس کے ساتھ تمہارے والا آدھا نوٹ نہ جڑ جائے۔ کہنے کو کوئی بھی نوٹ پھاڑ کر اس کا آدھا حصہ اس کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے، یوں یہ پورا تو ہو جائے گا لیکن مکمل نہیں ہوگا۔ اس کی

قیمت کچھ نہیں ہوگی۔ یہ محض ایک کاغذ ہی رہے گا۔ اس کی قیمت تب ہی بنتی ہے جب اس میں تمہارے والا آدھا نوٹ جڑ جائے۔ تو اب خود ہی سمجھ لو کہ میں اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ بے وقعت رہوں گا۔ وہ میرا آدھا حصہ ہے۔ وہ ہوگی تو میری کچھ قدر ہے، نہیں تو جو چاہے کر لوں، میری اوقات کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں کسی اور کے ساتھ رہنے کا سوچتا ہی نہیں۔ کیا فرق پڑ جائے گا اس سے۔ ادھورے پن کا احساس تو اس کے ساتھ ہونے سے ہی ختم ہوگا۔''

اس نے تیز تیز بولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ صاف تھا کہ وہ مجھ پر غصہ کر گیا ہے اور نہیں چاہتا کہ اب میں پھر اس موضوع کو چھیڑوں، اس لیے میں اس آدھے نوٹ کو گھورتا بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا، ہم دونوں خاموشی سے کھانے لگے۔ لیکن وہ جتنا بھی بدل گیا ہو، اتنی دیر خاموشی کو برداشت کرنا اس کے لیے اب بھی مشکل تھا۔ جب اپنی پلیٹ ختم کر کے ویٹر کو گریوی کے لیے تھما دی تو مجھے مخاطب کر کے خود ہی بول پڑا۔

''لگتا ہے کہ زندگی میں جو کچھ پانا تھا، پا لیا، اب تو گریوی کی زندگی بچی ہے، بس تھوڑی سی۔ آخری چند لقمے۔ بھوک خواہ جتنی بھی باقی ہے، انہی چند لقموں پہ گزارا کرنا پڑے گا۔ اسی لیے لطف لے لے کر گزارنا چاہتا ہوں۔''

''لطف..... خاک لطف ہے۔ تم تو زندگی کے لطف سے دور ہو گئے ہو۔'' میں نے منہ بنایا۔

''یار میرے خیال میں تو اصل زندگی وہی ہے جو انسان اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے گزارتا ہے۔ تو میں بھی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں۔ پھر لطف کیوں نہ آئے۔''

سب فضول تھا۔ پتا نہیں وہ کیا بن گیا تھا: ''کون سی ذمہ داری؟ یہاں اس گپھا میں بیٹھ کے تم کیا میرا..... کر رہے ہو؟''

''ذمہ داریاں تو بہت ہیں۔ پڑھ رہا ہوں، یہ اوپر والے نے ذمے لگایا ہے، لکھ رہا ہوں، یہ پتا نہیں، کون ذمے لگاتا ہے۔ جو کتاب مل جائے، چاٹ جاتا ہوں، جو کہانی اتر آئے، پوری ایمانداری سے اسے سنوارتا رہتا ہوں۔ یہ ذمہ داریاں کم ہیں کیا؟''

''یہ اصل ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ یہ تمہارا فرار ہے۔ اصل ذمہ داریاں تو ہیں کہ تم اپنے گھر والوں کو کچھ کما کے کھلاؤ، کہیں شادی کر لو تا کہ تمہیں زندگی کے اصل لطف سے آگاہی ہو سکے۔'' میں تپ گیا: ''لیکن ایک لڑکی نے تمہیں کیا مایوس کر دیا کہ اب تم زندگی کی طرف لوٹنا ہی نہیں چاہتے۔ مائی فٹ۔ لڑکی بھی کوئی اچھی ہوتی تو آدمی زندگی تباہ کرتا اچھا لگتا ہے۔ ایسی بے وفا لڑکی

کے لیے زندگی کیوں خراب کی جائے۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ وہ لڑکی اچھی نہیں تھی۔ اس سے ہٹ کر کہ اس نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا، تم اس میں کوئی عیب نہیں نکال سکتے۔ وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ لڑکی تھی۔ میرے ساتھ اس کا دل نہیں ملا تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اگر دل پہ کسی کا اختیار ہوتا تو سب سے پہلے میں اپنے دل کو سمجھاتا کہ اس کی طرف نہ لپکو۔'' اس نے روٹی کا آخری لقمہ منہ میں لینے کی بجائے واپس چھابے میں پٹخ دیا: ''اور پھر کیا اسے میں نے اس لیے چاہا تھا کہ وہ اچھی ہے۔ مائی فٹ۔ محبت ہونے کے لیے کسی کا اچھا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بس جس سے محبت ہو جائے، وہی دنیا میں سب سے اچھا لگنے لگتا ہے۔ مجھے اس سے محبت تھی، اس لیے وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ دیٹس اٹ۔ اس سے بڑھ کر میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔''

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ بل چکا کر ہوٹل سے باہر نکلے اور سٹاپ کی طرف ہو لیے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سٹاپ پر تھے۔

''تم اس کے بارے میں جو بھی سوچتے ہو لیکن اب اس کے ساتھ تمہاری اتنی وابستگی تمہیں کیا دے سکتی ہے۔ وہ تو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی نا۔ اب اس کی یاد میں بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟ رومانوی تحریک والوں کو زیادہ تو نہیں پڑھنے لگے؟''

''نہیں اس میں رومانویوں والی کیا بات ہے؟'' اس نے کمزور لہجے میں کہا، جانتا تھا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے: ''اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا دکھ کیوں کروں؟ وہ تو محض لڑکی تھی۔ ہزاروں دوسری لڑکیوں کی طرح۔ وہ مجھے اچھی اس لیے لگتی تھی کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ اگر محبت نہ ہوتی تو دوسری ہزاروں لڑکیوں کی طرح میں اسے بھی ککھ نہ سمجھتا۔ تو پھر اہم کیا چیز ہوئی .....؟ میرا جذبہ یا وہ لڑکی؟ وہ نہیں رہی تو کیسے غم ہے، میں خوش ہوں کہ میرا جذبہ تو میرے پاس ہے۔ میری محبت تو میرے پاس ہے۔ زندگی کسی لڑکی کے سہارے اچھی گزر جائے گی، اس کی کوئی ضمانت نہیں لیکن محبت کے آسرے پر تو اچھی زندگی گزاری جا سکتی ہے نا؟ اور میری محبت ابھی میرے پاس ہے۔ میں ابھی جی سکتا ہوں۔ وہ نہیں رہی تو کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے، پھر میرا بھی ایک مشورہ مان لو، تم ایسی کہانیاں لکھنا شروع کر دو جن میں عورت اور مرد کے رشتے کی نزاکت کو سمجھا جائے۔ یہ نابالغوں والی کہانیاں لکھنا چھوڑ دو۔ اگر یاد نہیں رہا تو پھر بتا دوں ان مصنفین کے نام جن کا ذکر ''اردو افسانے میں رومانویت'' میں کیا گیا ہے۔ تمہیں

بھی پتا چل جائے گا کہ کیسے اُس کی یاد میں بیٹھ کے کہانیاں لکھنی ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا: ''تمہیں اس سے چڑ ہو گئی ہے۔ تم یہ کیوں نہیں مان لیتے۔ اگر نہیں ہے تو پھر تمہاری سب کہانیاں لڑکی کے ذکر سے کیوں خالی ہیں؟ کیوں انکار کرتے ہو عورت کے وجود کا.....؟''

''بس، بس، اب تم میرے استاد نہ بنو۔ کہانی میں وہی لکھتا ہوں جو میرے ذہن میں آتی ہے۔ جس دن محبت کی کوئی کہانی ذہن میں آئی، وہ بھی لکھ دوں گا۔ پھر تم دیکھنا کہ میری کہانیوں میں لڑکی کا کردار کس طرح سے آتا ہے۔ پوجنے والی ہو گی وہ لڑکی۔'' اس نے آگے ہو کر ایک ہائی ایس کی طرف اشارہ کیا: ''ابھی تو تم اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ، اگر اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچنا ہے تو۔''

میں نے اس سے الوداعی چھیڑ لگائی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

لاہور سے نکلتے وقت تک ذہن میں اس کی باتیں خود بخود لہریں لے رہی تھیں۔ جب گاڑی موٹروے پر پہنچی تو گاڑی کے ہموار چلاؤ کی وجہ سے ذہن کو کافی سکون ملا۔ میرا ذہن یک سوئی سے اس کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ کیا وہ واقعی ابھی تک اس سے محبت کرتا ہے یا ختم ہو چکی ہے، لیکن کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ کیا وہ کبھی زندگی کی طرف واپس آ سکے گا؟ کیا اس میں جو ادھورا پن پیدا ہو گیا ہے، اس کو کبھی تکمیل مل سکتی ہے؟ موٹروے اتر کر سرگودھا کی طرف بڑھ رہا تھا جب بے اختیار میرا ہاتھ جیب تک پہنچ گیا۔ ایک کاغذ جیب سے ٹکرایا۔ باہر نکالا تو وہ وہی آدھا پھٹا نوٹ تھا جو اس نے مجھے دیا تھا۔ میں کافی غور سے اسے دیکھتا رہا، ظاہر ہے اس کی وقعت کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کا باقی آدھا حصہ تو اسی کے پاس رہ گیا تھا۔ میں نے بڑے پر ملال انداز میں کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور اس نوٹ کو تیز ہوا کے حوالے کر دیا۔ جائے، جہاں اس کی قسمت لے جائے اسے۔

☆☆☆

ضیغم رضا

ڈھائی سو بٹا تیس

اپنے ننھے تخیل کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے طاقت کے ہر سرچشمے کو آزما ڈالا۔ تھانیدار، فوجی، وڈیرا، صدر۔ میں ہر روپ میں استاد جیوایا کے سامنے تن کر کھڑا ہو جاتا۔ استاد جیوایا میری طاقت سے ذرا سا بھی مرعوب ہوئے بغیر سامنے سے گزر جاتا۔ اس کے کھسے کی چرر چرر مدھم ہوتی، نہ ہی اس کے ہاتھ میں جھولتا تین فٹا ڈنڈا ساکت ہوتا۔ جالی دار ٹوپی سر پہ جوں کی توں رکھے وہ میرے سامنے سے گزر جاتا اور میں ہونکوں کی طرح اس کی پیٹھ دیکھتا رہ جاتا۔ میں نے ایک منصوبہ اور بھی بنایا کہ کچھ شرارتی لڑکوں کو اکٹھا کر کے کسی دیوار کے پیچھے چھپ جاؤں اور جونہی استاد جیوایا گزرے اس پہ ڈھیلے برسائے جائیں۔ اس خیال کی سنگین کمینگی کو میں خود بھی نہ سہار پایا اور فوراً جھٹک دیا۔ ہر قسم کے انتقامی خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکنے میں حائل رکاوٹوں کے پیشِ نظر میں نے پسپائی اختیار کر لی اور اگلے دن کا سبق یاد کرنا شروع کر دیا۔

دراصل استاد جیوایا کو جچتا نہ تھا کہ مجھ سے ریاضی کے سوال حل کرا تا جب کہ سکول میں میرا پہلا دن تھا۔ قریبی قصبے کے ایک پرائیویٹ سکول میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد جب میں اپنے گاؤں کے مکتب سکول میں جانے لگا تو میری والدہ نے مجھے پہلی جماعت کی کتاب تھما دی۔ استاد جیوایا؛ جو سن چکا تھا کہ میں کچھ عرصہ پرائیویٹ سکول کی خاک چھان چکا ہوں، میرا امتحان لینے پہ تُل گیا۔ پچھلے سکول میں، میں نے بنیادی قاعدہ پڑھا تھا، پہلی جماعت کی کتاب تو میرے فرشتوں نے بھی نہ دیکھی تھی۔ اب چونکہ استاد کا حکم تھا اس لیے میں بھی ہم جماعتوں کے ساتھ لائن میں لگ گیا اور استاد جیوایا سوال بتانے لگ گیا۔ جمع نفی قسم کا ایک سوال میں نے سنا اور اپنی دانست میں ٹھیک جواب لے کر استاد کے سامنے لے گیا۔ میری سلیٹ پہ چند ثانیے نظر ٹکانے کے بعد سلیٹ کو چارپائی پر بجاتے ہوئے اس نے مجھے ڈانٹ پلائی: ''یہی پڑھتے رہے ہو؟ حساب تو آتا نہیں!''

میرا خیال تھا کہ سکول میں پہلا دن ہونے کی وجہ سے میں مار سے بچ جاؤں گا۔ سکول کے دوسرے استاد حاجی غلام اصغر میرے رشتے دار تھے اس لیے بھی مجھے رعائیت ملنے کی امید تھی

لیکن استاد جیوایا نے تو پہلے ہی دن میری گردن دبوچ لی۔ پیٹھ پر دو تین دھپیں اور پرائیویٹ سکول میں پڑھنے کا طعنہ مجھے ادھ موا کر گیا۔ میں نے ابھی دم لیا ہی تھا کہ باقی طالب علم اپنے جواب دکھا کے فارغ ہو گئے۔ ''اگلا سوال حل کرو'' استاد جیوایا کا حکم آیا۔ میں نے سوچا اب کی بار جواب ٹھیک ہو جائے تو شاید میں شاباشی لے کر سابقہ مار کا ازالہ کر لوں۔ اس نے پورے نو سوال کرائے، ہر دفعہ پیٹھ لال ہوتی اور پرائیویٹ ہونے کا طعنہ کان چھیدتا۔ خدا خدا کر کے میرا دسواں جواب ٹھیک ہوا استاد جیوایا نے پہلے تو میری کند ذہنیت کو کوسا جو عام سے سوالوں کو سمجھنے کے لیے بھی دس ''ٹرائیاں'' مارتا ہے اور پھر ہلکی سی شاباش دی۔

پہلے دن کے اس تلخ تجربے کے بعد میں گھر آیا تو سسکیاں بھرتا استاد جیوایا سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگا۔ کسی خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکنے کی بے بسی نے بالآخر مجھے اگلے دن کا سبق یاد کرنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے دن جب میں سکول پہنچا تو ابھی استاد جیوایا نہیں پہنچا تھا۔ کچھ لڑکے پہلے سے موجود تھے جو کہ جھاڑو دینے اور چھڑکاؤ کرنے پر لگے تھے۔ سکول کی عمارت محض ایک چھپڑ پر مشتمل تھی جس کو چند ستونوں نے سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ اسی چھپڑ کے سائے میں حاجی غلام اصغر کے جانور بھی باندھے جاتے البتہ دو فٹ اونچی ایک کچی دیوار نے طالب علموں اور جانوروں کے درمیان حدِّ فاصل قائم کر دی تھی۔ چھپڑ کے سامنے کوئی ایک کنال رقبے پہ محیط صحن تھا جہاں سردیوں میں طالب علم ٹاٹ بچھا کے دھوپ سینکتے۔ سکول کو چپڑاسی ایسی کسی آلائش سے ہمیشہ پاک رکھا گیا تھا لہذا صفائی بھی طالب علموں کے ذمے تھی۔

مجھے دیکھتے ہی سب یک زباں ہو کر بولے: ''چل اوئے صفائی کرا!!'' جھاڑو تھامنا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا البتہ چند لوٹے پانی کے بھر کر میں نے چھڑکاؤ میں مدد ضرور کی۔

ہم ٹاٹ بچھا کے بیٹھے ہی تھے کہ استاد جیوایا آدھمکا۔ چارپائی کے سرہانے اپنا ڈنڈا ٹکا کے اس نے ایک لڑکے کو حکم دیا: ''جا اوئے روٹی کا پتہ کر آ''

لڑکا دوڑا دوڑا حاجی اصغر صاحب کے گھر گیا اور رومال میں لپٹے ایک پراٹھے کے ساتھ چائے کی کیتلی اٹھا لایا۔ وہ جب کھانا کھانے لگا تو مجھے اس کے ندیدے پن پر غصہ آیا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے طالب علم کو کہنا چاہا کہ استاد جیوایا کتنا ''بُگھا'' ہے، صلح بھی نہیں مارتا لیکن میں خاموش رہا کہ اس نے بتا دیا تو میری شامت آ جائے گی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد وہ ہاتھ پونچھ کر بلکہ ہاتھ دھو کے طالب علموں کے پیچھے پڑ گیا۔ پہلی، دوسری اور پھر تیسری جماعت کے طالب علموں کو بالترتیب ''سبق لے آؤ'' کی پکار پڑتی اور طلبی والے طالب علم ڈرے سہمے کتاب اٹھائے پیشی بھگتانے چلے جاتے۔

بس یہی روز کا معمول تھا۔

دوسرے دن کے مشاہدے کے بعد مجھ پر کھلا کہ استاد جیوایا کا عتاب کسی بھی وقت اور کسی وجہ کے بغیر نازل ہوسکتا ہے۔ سب سے زیادہ چڑ تو اسے ان طالب علموں سے تھی جو اس کے سکول سے بھاگ کر دوسرے سکول میں چلے جاتے اور پھر واپس آ جاتے۔ ایسے میں وہ سبق نہ سنا سکنے والوں کی ٹھکائی تو کرتا ہی، طعنوں مہنوں سے یہ بھی باور کراتا جاتا کہ اس سکول سے بڑھ کر کسی اور سکول میں اگر تعلیمی معیار بلند ہوتا تو بھگوڑے طالب علم سولہ پاس کر کے ہی واپس آتے۔ یہ کوسنے اس وقت شدت اختیار کر جاتے جب کوئی تیسرا بندہ بھی سکول میں موجود ہوتا۔ پہلے وہ لوٹ کے گھر آئے بدھو کی نہ ہنجاری کا رونا روتا اور پھر اسکی داستان طرازی کا منتہیٰ وہ طالب علم ہوتے جو اس سے پڑھ کے افسر بننے کے قابل ہو چکے تھے۔ ہم ان افسر نما طالب علموں سے تو کبھی نہ ملے تھے البتہ ہمارا طالب علمانہ احترام اور استاد کا باوثوق و بلند آہنگ لہجہ ہمیں اس قدر مرعوب کر دیتا کہ سکول کے احاطے میں ہمیں وہ طالب علم افسرانہ تمکنت کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے۔

یہ بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے کہ استاد جیوایا جب بولتا تو اس کی آواز دور تک سنائی دیتی۔ اسے اس چیز سے غرض نہ تھی کہ وہ ٹھیک بول رہا ہے یا غلط۔ بس اسے یہ یقین ہوتا کہ وہ جو بول رہا ہے، ٹھیک ہے۔ اپنے طالب علموں کو دی گئی گالیاں ہوں یا اخلاقیات کی دھجیاں بکھیرنے والی وہ گفتگو جو محفل میں تو درکنار خلوت میں بھی پسینے چھڑا دے، استاد جیوایا بنا جھجکے با آواز بلند، کرنے سے نہ چوکتا۔ گفتگو کا موضوع بھلے ہی دنیا جہاں کے کسی پہلو سے متعلق ہوتا، وہ ہیر پھیر کر کے اسے اپنی من چاہی ڈگر پر لے آتا اور اس کی تان زمانے کو برا کہہ کر خود کو غازی ثابت کرنے پر ٹوٹتی۔ ہمیں اس گفتگو سے دلچسپی تو کیا ہو سکتی تھی بس یہ فائدہ تھا کہ جتنی دیر یہ گفتگو جاری رہتی، سبق سنانے کا مرحلہ ملتوی رہتا۔ یہ وقفہ بھی عارضی ہوتا کیوں کہ کوئی نہ کوئی طالب علم ایسی حرکت کر دیتا کہ استاد جیوایا کو اپنی گفتگو ملتوی کر کے اسکی طرف متوجہ ہونا پڑتا۔ گاؤں کا وہ فرد یا راہ گیر جسے استاد جیوایا مخاطب کر رہا ہوتا، اپنے کسی بھولے بسرے کام کو یاد کر کے اٹھ کھڑا ہوتا اور طالب علموں کی شامت آ جاتی۔ استاد جیوایا اپنی لنگی کے پلو از سر نو باندھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا اور جو بھی ہتھے چڑھتا اس کی

خوب درگت بناتا۔ ''بندے دے پتراو کے ڈھانڈے دے، کوئی آ جوہے؛ مجال نئیں جو آرام نال بیٹھے رہو۔'' اس کے تشدد کو جو طالب علم زیادہ سنجیدہ لیتا یعنی باقاعدہ رونے لگتا تو نصیحتوں کا سارا ملبہ اسی پر گرتا، بسا اوقات سبق بھی سب سے پہلے اسی سے سنا جاتا۔

عام حالات میں اگرچہ سبق یاد نہ ہونے کی صورت میں زیادہ مار نہ پڑتی لیکن اگر گاؤں کا کوئی معمولی پڑھا لکھا فرد آ بیٹھتا تو قاعدہ الٹ ہوتا۔ سب سے پہلے استاد جیوایا اس کے سامنے اپنے طالب علموں کی تعریفوں کے پُل باندھتا اور پھر کسی طالب علم کو بلا کر اس سے اگلی جماعت کی کتاب پڑھواتا۔ قرعہ اگر دوسری جماعت کے طالب علم کے نام نکلتا تو اسے تیسری جماعت کی کتاب استاد جیوایا کے اس ابتدائیے کے ساتھ تھمائی جاتی: ''سائیں یہ تو تیسری کی کتاب ہے میں کہتا ہوں اس سے دسویں کی کتاب پڑھائی جائے تو بھی فرفر پڑھنے لگے۔''

کیوں کہ استاد جیوایا کو بخوبی علم ہوتا کہ کونسا طالب علم کس پانی میں ہے لہذا اس کے سامنے وہی صفحہ کھولتا جو وہ بآسانی پڑھ لیتا۔ عموماً طالب علم استاد کا بھرم رکھ لیتا لیکن اگر اس کے نحیف کاندھے بوجھ کی تاب نہ لا سکتے تو اجنبی کے سامنے استاد جیوایا زہر پی جاتا: ''نامرادا! کلھ تاں سنایا ہاوی'' طالب علم کو مشفقانہ لہجے میں کہہ کر وہ یہ باور کراتا کہ طالب علم جھجک رہا ہے لیکن جونہی وہ شخص جاتا استاد جیوایا کھسہ اُتار کے طالب علم کی گردن لال کر دیتا۔

استاد جیوایا کی روزمرہ گفتگو میں اگرچہ علاقے کے معمولی واقعات ہوتے اور ماضی حال کا تقابل ہوتا لیکن ایک دفعہ میں نے اس کی طبیعت پر بلا کا جوبن دیکھا۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد کس اخبار میں اسامہ بن لادن کے بارے میں ایک خبر چھپ کر آئی جو کہ استاد جیوایا نے بھی پڑھ ڈالی۔ اگلے کئی دنوں تک اس کی گفتگو کا موضوع یہی واقعہ ہی رہا۔ سکول میں جو شخص بھی اس واقعے کو ٹہوکا دیتا، استاد جیوایا سیدھا ہو بیٹھتا۔ چارپائی پر گھٹنے سکیڑ کر وہ ایک ہاتھ ان کے گرد حمائل کرتا اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ کے کش لگاتا، اس واقعے پر اپنا تبصرہ سناتا رہتا۔ اس واقعے سے استاد جیوایا کی دلچسپی کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی البتہ اسامہ اس کا ''ہم ریش'' ضرور تھا۔ اپنے نحیف لامبے قد اور اور لمبوترے چہرے کی ابھری ہڈیاں بھی اسے معمولی سا اسامہ کے مشابہ بنا دیتیں۔ اسامہ کبھی اسے امام مہدی کا روپ نظر آتا تو کبھی وہ نائن الیون کے واقعے کو ملتِ اسلامیہ کے عروج کا نقطۂ آغاز گردانتا۔ بڑی روانی سے استاد جیوایا ان روایات کو دہراتا جس میں قیامت سے قبل دجال کی آمد اور اس کے بعد اسلام کے بول بالا کی نوید تھی۔ اس کے بیان میں اگر کوئی بندہ سقم کی نشاندہی کرتا تو وہ امریکہ کو دجال

کے روپ میں اور اپنے دور کو دجالی فتنے سے تعبیر کر لیتا۔ بعد میں میری اردو افسانوں تک رسائی ہوئی تو مجھے منگو کوچوان اور انتظار حسین کے افسانوں میں عوامی مفروضوں والی فضا بالکل حقیقی معلوم ہوئی۔

اگر چہ گرمیوں میں گیارہ بجے جب کہ سردیوں میں بارہ بجے استاد جیوایا ہر حال میں سکول کو خیر آباد کہہ دیتا لیکن اس واقعے کے بعد پورا ستمبر وہ اوور ٹائم لگاتا۔ ہم لاکھ مچلتے استاد جی چھٹی کر دیں پر اس کی ایک ہی ڈانٹ ہمارا دم سادھنے کی لیے کافی ہوتی ''اوئے کھوتی دے پترو! بندے کوں گالھ وہی کرن ڈتی کرو۔''

گھڑی ان دنوں استاد جیوایا کے پاس نہیں ہوتی تھی۔ بس اس کا اصول تھا کہ استاد اصغر کے گھر کی دیوار کا سایہ مغرب کی طرف جب ایک فٹ جتنا رہ جائے گا؛ وہ چھٹی کر دے گا۔ حاجی غلام اصغر سینئر ہوتے ہوئے استاد جیوایا کے معاملات میں کم ہی دخل دیتے۔ وہ چوتھی پانچویں جماعت کو پڑھاتے تھے اور چھٹی دینے کا اختیار بھی ان کے پاس انہی جماعتوں کا تھا۔ جس دن استاد جیوایا چھٹی کیے بغیر چلا جاتا اس دن ہم حاجی غلام اصغر کے رحم و کرم پر ہوتے۔

استاد جیوایا کی ذات سے جڑا ایک دلچسپ قضیہ اس کی تنخواہ کا تھا۔ مکتب سکول ہونے کی وجہ سے اس کی تنخواہ محض ڈھائی سو روپیہ تھی۔ پانچ چھے ماہ بعد وہ میرے ماموں کو چیک تھماتا اور اکٹھی تنخواہ وصول کرتا۔ وہ خود کبھی تنخواہ لینے نہ گیا کہ تحصیل تک جانے اور آنے کا کرایہ اس کی آدھی تنخواہ لے ڈوبتا۔ کبھی کبھار بینک میں چھٹی ہوتی یا کسی وجہ سے تنخواہ نہ مل پاتی تو استاد جیوایا بینک اور تعلیمی محکمہ کو وہ بے نقط سناتا کہ الامان! ہمیں حیرانی تھی کہ وہ ڈھائی سو روپے میں پورا مہینہ کیسے چلا لیتا ہے۔ کوئی اگر اس بابت پوچھ لیتا تو اس کی بے نیازی دیدنی ہوتی: ''میں ماروی سگریٹ پیتا ہوں اسّی نوّے روپیہ سارا خرچہ ہے اس کا، باقی رزق کا وارث اللہ ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جوانی کے واقعات بیان کرنے لگتا۔ کیسے اس دور میں لوگ بنا نمک گھی والے ساگ پر کئی کئی دن گزارا کرتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ موجودہ دور کی نازک اندام زندگی پر لعنت بھیجتا وہ اپنی قناعت پسندی کو ایسے فخر سے بیان کرتا کہ سننے والا بجائے اس پر ترس کھانے کے، رشک کرنے لگتا۔

کچھ عرصہ بعد حاجی غلام اصغر نے بھی ایک ہزار دینا شروع کر دیا۔ ہمارے گاؤں کے گرلز سکول میں قرآن پاک پڑھانے کا ہدیہ بھی دیا جاتا لیکن استاد جیوایا کے معاملات و معمولات جوں کے توں رہے۔ کامل پندرہ سال پہلے والے استاد جیوایا کو جب میں دیکھتا ہوں تو ریٹائرمنٹ کے بعد کی بونس زندگی گزار لینے کے باوجود بھی اس میں وہی چستی اور تحرک پایا جاتا ہے۔ اب بھی

وہ پابندی سے سات بجے گرلز سکول میں قرآن پڑھا کر مکتب سکول آتا ہے اور پھر علاقے میں ان چند گھروں کا رخ کرتا ہے جہاں باقاعدگی سے وہ بچیوں کو قرآن پڑھانے جاتا ہے۔

حکومتیں بدلیں، حالات نے کروٹیں لیں، اس سے پڑھے ہوئے کئی طالب علم افسر نہ سہی افسروں جیسی تمکنت ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا جھولتا رہتا ہے، کھسے کی چرر چرر اب بھی کسی کے سامنے مدھم نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ۔۔۔۔ صرف ایک دفعہ میں اسے نظر انداز کر گیا۔

ہوا یوں کہ ان دنوں میں ایف اے کا طالب علم تھا۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کیلئے میں گھر سے نکلا تو استاد جیوایا امام مسجد کے ساتھ نماز ادا کر کے واپس آ رہا تھا۔ میں امام مسجد سے مصافحہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ بعد میں مجھے امام مسجد نے بتایا کہ استاد جیوایا نے بھی مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا جسے تم نظر انداز کر گئے۔ مجھے وقتی طور پر دکھ ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ کونسا میں اب اس کے سکول میں پڑھتا ہوں، اپنی ندامت پر قابو پا لیا۔ اس واقعے کے بعد کئی دفعہ میں استاد جیوایا سے ملا لیکن کبھی بھی اس نے رنجش کا احساس نہ دلایا۔

میں سمجھا بڑھاپے کی وجہ سے وہ یہ بات بھول چکا ہوگا اور مطمئن ہو گیا۔ پھر ایک دن جب کہ میں ایم اے کا امتحان دینے کے بعد گھر پر تھا تو میرے والد نے میرے ذمہ لگایا کہ آج استاد جیوایا آئے گا اس سے ختم پڑھوا لینا۔ شام پانچ بجے استاد جیوایا پورے وقت پر پہنچ گیا۔ کھانا ابھی تیار نہیں ہوا تھا اس لیے استاد جیوایا کو کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔ انتظار کی کوفت سے بچانے کے لیے میں نے اسے باتوں میں لگا دیا۔ باتوں باتوں میں اس نے ایک ایسا اشارہ بھی کر دیا جس سے میری طرف سے اس کو نظر انداز کیے جانے کی تلخی موجود تھی۔ جنوری کی اس شام کو میں نے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس کی۔ میرے ذہن میں ایک کمینہ خیال آیا کہ میں نے استاد جیوایا سے پہلے دن والی ساری پٹائی اور پڑھنے کے دوران میں اس کی دی گئیں ساری گالیوں کا قرض وصول کر لیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے کاندھوں پر بھاری بوجھ محسوس کیا۔ ''میں نے تو اپنا قرض وصول کر لیا، استاد جیوایا نے جو مجھے پڑھایا تھا؛ وہ قرض میں کیسے چکاؤں؟''

ڈھائی سو روپے میں پورا مہینہ پڑھانے والے اللہ جیوایا کا استادانہ قرض چکانے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ''استاد جی ختم پڑھنے کے بعد میرے لیے بھی دعا کرنا'' میری آواز میں لکنت تھی۔

☆☆☆

چند باتیں عابد خورشید کے لیے

ڈاکٹر عابد خورشید کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ان کی آواز کو ۹۰ء کی دہائی میں ابھرنے والی اہم ادبی آوازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عابد خورشید نے اپنے شعری سفر کا آغاز شاعری سے کیا تاہم تحقیق وتنقید میں بھی انھوں نے اپنے صلاحیتوں سے علمی وادبی حلقوں میں اپنا اعتبار قائم کیا ہے۔ان کی تحریریں اہم ادبی جرائد کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ان میں ''اوراق'' (لاہور) ''شعر وحکمت'' (بھارت) ''ماہِ نو'' (لاہور) ''ادبیات'' (اسلام آباد) ''تسطیر'' (اسلام آباد) 'الحمرا'' (لاہور) ''تخلیق'' (لاہور) ''کاغذی پیرہن'' (لاہور) ''سمبل'' (راولپنڈی) ''نقاط'' (فیصل آباد) ''اجمال'' (کراچی) وغیرہ شامل ہیں۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''لمس'' ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا جبکہ نظموں کا تازہ مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے۔ اس کے ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں میں ''نقوشِ سرگودھا'' ۲۰۰۵ء، ''باتیں جیلانی جی کی'' (پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے) ۲۰۰۷ء، ''وزیر آغا کی بائیس نظمیں'' ۲۰۰۷ء، ''نئے مکالمات'' (ڈاکٹر وزیر آغا کے انٹرویوز) ۲۰۰۹ء، ''پروفیسر یوسف خالد کی تخلیقی جہات'' ۲۰۱۶ء، ''ذکر وزیر آغا'' ۲۰۱۶ء، ''نگہتے'' (پروفیسر ریاض احمد شآد کے مضامین کی تحقیق وتدوین) ۲۰۱۶ء، نمایاں کتب ہیں۔

عابد خورشید ۱۱ر جنوری ۱۹۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی مراحل سرگودھا ہی میں طے کیے۔انھوں نے ایم فل اردو کا مقالہ ''ن م راشد کی شاعری میں تلمیحات'' کے عنوان سے تحریر کیا جبکہ سرگودھا یونیورسٹی ہی سے ''اُردو میں طویل نظم کی فکری وفنی روایت'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔وہ ایک ادبی رسالے ''ابجد'' کے مدیر بھی ہیں جو ۲۰۱۴ء میں جاری ہوا تھا۔

عابد خورشید نے غزل اور نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ان کی شاعری فرد کے انفرادی احساسات، نفسیاتی الجھاؤں اور سماجی عدم توازن کے اثرات کو بالواسطہ طور پر پیش کرتی ہے۔ان کی چند غزلیں قارئیں کی نذر کی جارہی ہیں۔

☆☆☆

غزلیات

بجھ گئی آنکھ تو پھر راکھ بہا دی جائے
یعنی اس راکھ میں پھر آگ لگا دی جائے

اب تو اِس شہر کی ہر چیز دُھواں دیتی ہے
کیوں نہ اِس شہر کو اَب آگ لگا دی جائے

آج سے تیری الگ میری الگ دُنیا ہے
ایک دیوار سرِ عرش اُٹھا دی جائے

جیسے جنگل کو کوئی اوڑھ کے بیٹھا ہوا ہو
آپ کو آپ کی تصویر دِکھا دی جائے

اشتہارو ! مجھے اِس راہ سے گزرنا ہے اَبھی
میرے رستے سے ہر اِک چیز ہٹا دی جائے

زندگی آ گئی پھر تشنہ لبی کے دَر پر
زخم کی نوک سے یہ پیاس بجھا دی جائے

دُھوپ چُبھنے لگی آنکھوں میں تری ، اے خورشیدؔ
اِک ذرا دیر تری لو ہی گھٹا دی جائے

☆☆☆

کیسی اُفتاد ہے کہ ہوش میں آنے لگا ہے
یہ مرا شہر ! مجھے آنکھیں دِکھانے لگا ہے

کچھ بھی ہو جائے یہ جنگل ہے ، یہ جنگل رہے گا
تو یہاں پھر سے کوئی شہر بسانے لگا ہے

یوں بھی تنہائی یہ باہر سے نہیں آ سکتی
کوئی مجھ سے مرے بھید چھپانے لگا ہے

بارہا گھر کو کبھی باندھا ، کبھی کھولا ہے
اے مرے دِل تُو یہاں کس کے دھیانے لگا ہے

کیسی اُجلت ہے کہ دم سادھ کے بیٹھے ہوئے ہیں
ایسا لگتا ہے کوئی سانس میں آنے لگا ہے

میں یہاں اپنی جراحت کے لیے آیا تھا
کیا رفوگر ہے مجھے زخم دِکھانے لگا ہے

☆☆☆

آج کچھ دِل کھچا کھچا سا ہے
سانس آنا تو اِک دلاسا ہے

پھر کُھلی ہے کتاب آنکھوں کی!
اس میں پھر بھید اِک ذرا سا ہے

کس کی خاطر ہے دید کا اَمرت
کون اِس زہر کا پیاسا ہے

یہ جو نقش و نگار بگڑے ہیں
زندگی کا یہی خلاصا ہے

میں جو اَندر سمٹ گیا ہوں تو کیا
میرے اندر میرا اثاثہ ہے

دینے والے ذرا دھیان سے دے
آنکھ اُس کی ہے میرا کاسہ ہے

باندھ لیتی ہے موج ساحل سے
پانیوں کا یہی تو خاصا ہے

☆☆☆

وہ لکھ کے دے گا مجھے جو بھی کچھ پڑھا ہوا تھا
کسی سے میں نے بھی اس شخص کا سُنا ہو اتھا

گِرا تھا دھم سے کوئی کائنات کی صورت
کسی کو یاد تو ہو گا زمیں پہ کیا ہوا تھا

میں سخت جان بہت ہوں پہ لڑکھڑا گیا ہوں
شرابِ غم میں بہر طور کچھ ملا ہوا تھا

یہ چیخ تھی کسی ٹھہرے ہوئے زمانے کی
کسی کا دم اِسی آواز پر رُکا ہوا تھا

یہ نام و ننگ ، روایت سے کٹ کے کچھ بھی نہیں
یہ سلسلہ میرے اسلاف سے جُڑا ہوا تھا

یہ کیا ہلا ہے کہ خود چل پڑا ہے یہ گھڑیال
یہ سانس کتنے یگوں سے یونہی رُکا ہوا تھا

یہ چاند اور یہ سورج الگ الگ ہوئے تھے
فلک ، زمین سے کیوں ، کس لیے جدا ہوا تھا

☆☆☆

گرد چہرے سے جھاڑنا ہے مجھے
آئینے کو سنوارنا ہے مجھے

اِس لیے وقت مجتمع کیا ہے!
ایک لمحہ سہارنا ہے مجھے

دِن کی تزئیں مل گئی ہے اُسے
شب کی رونق اُتارنا ہے مجھے

اے خدا اپنا کچھ ٹھکانہ کر
بوجھ سَر سے اُتارنا ہے مجھے

سانس میں دفن کر چکا ہوں اسے
اَب فقط اُس کو مارنا ہے مجھے

اے فلک تھامنا میرے بازو
آج کا دِن گزارنا ہے مجھے

☆☆☆

بے سبب آئینے میں رکھا ہوا
یہ کناروں سے خواب ٹوٹا ہوا

میں نے تصویر کھینچ لی اُس کی
ایک آنسو تھا مسکرایا ہوا

اَب کہیں جا کے وہ سنائی دیا
جانے کس وقت کا پکارا ہوا

ہم ہیں دونوں الگ الگ مصرعے
قافیہ ہے فقط نبھایا ہوا

آج ڈولی زمیں سے اُٹھے گی!
آج سے یہ جہاں پرایا ہوا

بے لباسی دِکھا گئی ہے مجھے
خواہشوں نے لباس پہنا ہوا

اُس کی آنکھوں کا ذائقہ خورشیدؔ
یہ مرے آنسوؤں میں آیا ہوا

☆☆☆

دُکھ پہاڑوں میں بھر گیا کوئی
غار میں دب کے مر گیا کوئی

شب کی آنکھوں پہ دستکیں دے کر
خواب پلکوں پہ دھر گیا کوئی

اُس کے رستے میں پھول رکھے تھے
پاؤں رکھ کر گزر گیا کوئی

تم نے دیکھا ہے اُس کنارے کو
اُس سے آگے گزر گیا کوئی

گانٹھوں کو سمیٹنے کے لیے
پتّی پتّی بکھر گیا کوئی

دِل میں یادوں کا اِک سمندر تھا
اُس کے اندر اُتر گیا کوئی

کتنا دشوار راستہ خورشیدؔ
کتنا آسان کر گیا کوئی

☆☆☆

ساحلوں کو چھوڑ کر ، گہرے سمندر تک گئے
ہم کسی کو دیکھنے آنکھوں کے اندر تک گئے

یہ تو ممکن ہی نہ تھا نروان مل جاتا ہمیں
ہم تو بس اُس کے لیے خوابوں کے مندر تک گئے

کب ہوا کہ بات آ کر شب کدوں پر رُک گئی
روشنی کے واسطے صبح کے منظر تک گئے

پانیوں کا رزق ہونا اپنی قسمت میں نہ تھا
مچھلیوں کے ساتھ ہم بوئے قلندر تک گئے

دیکھ ! اے منظر !! سرکتی شام کا پورس ہوں میں
جس کو پانے کے لیے کتنے سکندر تک گئے

آنسوؤں کی ریز گاری ، مٹھیوں میں بھینچ کر
بھوک لینے کے لیے ہم بھی تونگر تک گئے

☆☆☆

آئینہ دیکھتا رہ گیا تھا
عکس جھیل میں جا گرا تھا

لوگ مجھ کو تلاش کرتے رہے
میں اُس کی باتوں میں کھو گیا تھا

دِل کی رفتار تھم گئی تھی
چلتے چلتے وہ رُک گیا تھا

آنکھیں اوندھی پڑی تھی پلکوں پر
خواب دو لخت ہو چکا تھا

دب گئی چیخ ، خامشی میں
کوئی کانٹے میں چبھ گیا تھا

کوئی آیا تھا سانس پھونکنے کو
میں اپنے آپ میں چھپ گیا تھا

☆☆☆

میں اُس سے دِل کی کہتا ہوں ، بات کتابی ہو جاتی ہے
لفظ سے لفظ تو مل جاتے ہیں پھر بے تابی ہو جاتی ہے

سورج اور تارے تو اُس کی پلکوں کے پیچھے رہتے ہیں
وہ آنکھوں سے چُھو لے پھر تو شام شرابی ہو جاتی ہے

کب تک اُس دہلیز پہ بیٹھے اپنی عمریں کاٹو گے !
دِل کا تالا کُھلنا ہو تو آنکھ ہی چابی ہو جاتی ہے

کس کافر نے آپ کے دِل کو ہاتھ لگا کر دیکھا ہے
آپ ہی اِس میں دم آتا ہے آپ خرابی ہو جاتی ہے

آنسو کی بیلیں سی جیسے چڑھ آئی دِیواروں پر
پانی لگتا رہتا ہو ، بنیاد سیلابی ہو جاتی ہے

مجھ کو ایسے شعر بھی کہنے آتے ہیں عابدخورشید
جن کو سُن کر خود سے خود ہی شکل گلابی ہو جاتی ہے

☆☆☆

گزرے ہوؤں کا نقش بھی رکھا بہاؤ نے
رستہ بنا دیا ہے سمندر پہ ناؤ نے

اِک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ساتھ بھی نہیں
ایسے ہوا کو باندھ رکھا ہے الاؤ نے

دیکھا جو اُس کی آنکھ کے ساحل سے اُس طرف
صحرا بنا دیا تھا کسی کو ، کٹاؤ نے

پتھر کی اِک چٹان تھی پانی میں بہہ گئی
کیا کچھ کیا نہ تیرے بدن کے کساؤ نے

بازار کی نظروں میں گراتی ہے اَرزنی
لیکن کسی کو تھام کے رکھا ہے بھاؤ نے

خورشید کھینچتا ہے ، فلک کی مچان سے
جکڑا ہوا ہے مجھ کو زمیں کے جھکاؤ نے

☆☆☆

گزر گئے ہیں وہ لمحے مجھے یہ غم تو ہے
وضاحتوں کے لیے میرے دم میں دم تو ہے

میں بے سکون رہوں تب ہی ٹھیک رہتا ہوں
میرے جنوں کی صراحت ، میرا بھرم تو ہے

اگرچہ بیت چکا ہے غبار کا موسم
یہ ملگجی سی فضا اَب بھی محترم تو ہے

کہو حروف کے کاتب کو جاننے والو!
ہتھیلیوں پہ مری کچھ نہ کچھ رقم تو ہے

میں آسماں کی فرازی کو پا نہیں سکتا
تخیلات پہ یہ میرا ہم قدم تو ہے

کسی کے سانس کی قربت ملی تو ٹھیک عابدؔ
وگرنہ ایک طرف زینۂ عدم تو ہے

☆☆☆

ہر ایک شاخ کی جب اپنی اپنی خُو ہو گی
پھر اُس تنے میں کہاں حسرتِ نمو ہو گی

نظر کے رُخ پہ جہاں باندھ لیا ہے ہم نے
کوئی بھی آنکھ یہاں اَب نہ چار سو ہو گی

اشارے اوڑھ کے رکھے ہوئے ہیں آنکھوں میں
تو آج طے ہے کہ ہم سے نہ گفتگو ہو گی

دوائیوں کی کثافت نہ بیٹھنے دے گی
تمھاری اپنی طبیعت لہو لہو ہو گی

سکوت ٹھہرا ہوا ہو گا ، دَر پہ چپ سادھے
ر ایک ساعتِ گزراں یہ ہو بہو ہو گی

جھلک چھلکنے کو تیار ہے ذرا دم میں
ذرا سی دیر میں ، مَیں ہوں گا اورتُو ہو گی

☆☆☆

رات ، مجھ کو چھوڑ کے سوئی الگ
بانسری کی لَے نہیں روئی الگ

ہو گئی ہے پیڑ سے ٹہنی الگ
زندگی ہو گی اگر ! ہو گی الگ

جو کہا سب کو مجھے بھی کہہ دیا
بات کوئی تھی نہیں میری الگ

پالکی کے ساتھ کتنے لوگ تھے
کس کی تھی بارات ، جو گزری الگ

اُس کے جانے سے ہوا کچھ بھی نہیں
جل اُٹھا دیپک الگ ، باتی الگ

خود کو خود سے کاٹ کے رکھ دے کوئی
تم نے دیکھا ہی نہیں کوئی الگ

کون جُڑ کر شام بھر بیٹھا رہے
میں الگ ہو جاؤں گا تُو بھی الگ

☆☆☆

ہم پر اکثر عشق کا موسم یوں ہوتا ہے
پھر جب اُس کا غم ہوتا ہے ، جوں ہوتا ہے

اُس نے کہا تھا : کیا ہو گا ، اور میں نے کہا تھا
یوں ہوتا ہے ، یوں ہوتا ہے ، یوں ہوتا ہے

ایک طرف اِک بادشاہ کی بیٹی ہوتی ہے
ایک طرف اِک جنگل میں مجنوں ہوتا ہے

پہلے قبر سے جا کر اپنا سر لگتا ہے
اس کے بعدپھر مصرعہ اِک موزوں ہوتا ہے

پانی میں بس گرہ لگا کر آ جانا ہے!
آنکھ سے آگے ، کاجل کا افسوں ہوتا ہے

ہر آنسو کی آنکھ میں یہ سوال ہے عابدؔ
سب کچھ میرے ساتھ ہی آخر کیوں ہوتا ہے

☆☆☆

سانس کا ، موت کا ، محبت کا
ایک ہے راستہ ، محبت کا

درمیاں تم فضول آئے ہو
معاملہ تھا _ _ _ _ _ میرا ، محبت کا

ہم نے دو مختلف مناظر میں
آئینہ رکھ دیا محبت کا

زخم کے درمیاں سے گزرے ہو؟
آپ کو کیا پتہ ، محبت کا

جسم لتھڑا ہوا ہے زخموں سے
تھا کوئی واقعہ ، محبت کا

ساری تقسیم فرشتوں کو ملی
آدمی ہو گیا محبت کا

رو دیئے آنکھ کے سبھی آنسو
ہنس پڑا قہقہہ ،محبت کا

☆☆☆

زمیں کے زخم کو چاہو تو بھول جاؤ اَبھی
تمھیں یہ کس نے کہا تھا کہ مسکراؤ اَبھی

مجھے تو اور کئی کام کرنے ہوتے ہیں
تمھارا فرض نہیں ہے کہ یاد آؤ اَبھی

پھر اِس کے بعد گھنی رات کا سفر ہو گا
اَبھی بھی وقت ہے چاہو تو لوٹ جاؤ اَبھی

کہیں سے پیار کے دو گھونٹ پلا دو اس کو
نظر بھی اَٹکی ہوئی ہے کہیں سے لاؤ ابھی

ابھی تو دوپہر کے بعد دُھوپ آنی ہے
تمھارا حکم ہے خورشید ڈوب جاؤ اَبھی

☆☆☆